گرو رجنیش لیکچرز

شہوانیت سے الوہیت تک

شہوانیت سے الوہیت تک

گورو رجنیش

شہوانیت سے الوہیت تک

(لیکچرز)

گورو رجنیش

مترجم: سلیم اختر

نگارشات ○ میاں چیمبرز ○ 3- ٹمپل روڈ ○ لاہور

فون : 042-6362412 ,042-6[illegible]241 فیکس : 042-6312968

E-mail:nigarshat@yahoo.com

نام کتاب: شہوانیت سے الوہیت تک (لیکچرز)
مصنف: گرو رجنیش
مترجم: سلیم اختر
سال اشاعت: 2002ء
ناشر: آصف جاوید
نگارشات پبلشرز
میاں چیمبرز، 3 ٹمپل روڈ، لاہور
مطبع: المطبعۃ العربیہ لاہور
قیمت: روپے

ترتیب

پہلی بات

گورو رجنیش کی ہمہ جہت شخصیت کی طرح اس کے متنوع فکری جہان کو بھی پیچیدگی اور متناقض کا امتزاج قرار دیا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر ایک خالی الذہن قاری غیر جانبداری سے اس کے نظریات و خیالات کا مطالعہ کرے تو رجنیش کے بارے میں واضح اور درست رائے قائم کرنا ناممکن نہیں رہتا۔

گورو کی تعلیمات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے' لیکن اس سے پہلے یہ امر مد نظر رکھنا پڑے گا کہ وہ ایک ایسا عالم بھی ہے جس کو علوم شرقیہ و غربیہ پر کافی حد تک دسترس ہے۔ وہ اپنے انکار کی تائید میں اس نوعیت کی منطقی دلیلیں اور شواہد پیش کرتا ہے' جن سے یکسر انکار عقلی تقاضوں سے بعید ہے۔

رجنیش چاہتا ہے کہ جنس کے حوالہ سے ناروا معاشرتی اور اخلاقی دباؤ ختم ہو تاکہ اسے ایک بے ساختہ فطری تخلیقی قوت کی حیثیت سے تسلیم کروایا جاسکے۔ اس حوالہ سے اسے یقین ہے کہ جنسی رویئوں کو درپیش سماجی گھٹن آخر کار ختم ہوگی اور تب اس قوت کو مثبت انداز میں بروئے کار لاکر تعمیر ذات اور تفہیم ذات کی منزل تک انسان کی رسائی ممکن ہوسکے گی۔

وہ کہتا ہے کہ جس طرح دریا کو اپنے راستے تلاش کرنے کیلئے کسی گائیڈ بک کی ضرورت نہیں ہوتی' اسی طرح جنسی تقاضے اور ضرورتیں بھی زیادہ دیر تک غیر ضروری معاشرتی بندھنوں کی رہنمائی کو قبول نہیں کرسکتیں۔ اس مثال سے وہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ تمام تر لسانی' قومی' نسلی' مذہبی اور علاقائی تعصبات کے باوجود جیسے کسی دریا کے ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی ویسے ہی جنس کی ہمہ گیر افادیت اور ضرورت کو بھی الگ الگ خطوں میں مختلف قسم کے ضابطوں کا غلام بنا کر رکھنا ناممکنات میں سے ہے۔

عشق کے تصور کو بھی رجنیش وارفتگی اور پسندیدگی کے ساتھ جنس کے الحاق کے بغیر

خام سمجھتا ہے۔ یوں اس کا "تصور عشق" مشرقی اور مغربی "فلسفہ محبت" کا ملغوبہ بن جاتا ہے کیونکہ وہ خالص جنسی محبت میں بھی کشش محسوس کرتا ہے اور مجازی و حقیقی منزلوں کی صوفیانہ اصطلاحوں کو بھی نہیں بھولتا۔ یہی غیر متوازن اور غیر متعین "تصور محبت" اسے ایک نئی اصطلاح اختراع کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اب رجنیش کہتا ہے کہ "روحانی جنس" کی تفہیم کے بعد انسان خالق کے ساتھ وصل کی لذت سے فیض یاب ہوسکتا ہے' چنانچہ بنیادی اہمیت اسی "روحانی جنسیت" کو حاصل ہے۔

قارئین! یہی وہ مرحلہ فکر ہے' جہاں رجنیش اپنے نو تشکیل شدہ "روحانی جنسیت" کے فلسفہ کو منطقی دلائل و براہین کے ساتھ پیش کرنے میں بڑی حد تک ناکام رہتا ہے کیونکہ ایک بنیادی جبلی اور فطری عمل کو روحانیت کا لبادہ اوڑھا کر ناقابل فہم بنا دینا جتنا آسان ہے' اسے اس شکل میں دوسروں سے تسلیم کروانا اتنا ہی مشکل بلکہ ناممکن ہے' جبکہ مخاطب لوگوں میں روحانیت کو نہ ماننے والے بھی شامل ہوں۔

سطور بالا میں ہم نے گورو رجنیش کے صرف جنس سے متعلق خیالات و افکار کا مختصر سا جائزہ لیا ہے' لیکن اگر اس کے پورے فکری نظام کو ایک جملے میں بیان کیا جائے تو یہ کہنا بہت حد تک مناسب ہوگا کہ رجنیش جنسی' معاشی اور سیاسی حوالوں سے بنی نوع انسان میں فطری آزادی' خود ارادی اور مساوات کا خواہاں ہے۔

رجنیش کی کل تصنیفات کی تعداد چار سو سے زائد ہے' لیکن جنس کے موضوع پر اس کی صرف ایک ہی تصنیف "Kama to Rama" ہے جو بین الاقوامی شہرت کی حامل ہے۔ اسی کتاب کا ترجمہ ہم پاکستان میں پہلی بار "شہوانیت سے الوہیت تک" کے نام سے شائع کررہے ہیں۔ امید ہے باذوق قارئین پذیرائی سے نوازیں گے۔

ادارہ

پہلا باب

جنس: محبت کی شروعات

جانِ عزیز!

محبت! ...... محبت کیا ہے؟ محبت میں جینا اور اسے محسوس کرنا سہل ہے لیکن اس کا متعین معنی بیان کرنا دشوار ہے۔ مثلاً اگر تم مچھلی سے یہ دریافت کرو کہ سمندر کیسا ہے؟ ...... تو مچھلی اس کے جواب میں کہے گی: "یہ سمندر ہے' سب اطراف میں دیکھ لو ...... یہی سمندر ہے ...... اور ...... بس۔" اگر تم اصرار کرتے ہوئے کہو: "مہربانی کرو ہمیں سمندر دکھاؤ مت بلکہ اس کا متعین معنی بیان کرو۔" ...... تو مسئلہ اور گمرا ہو جائے گا۔ انسان کو جو کچھ ہونا چاہیے وہ بے حد اچھی' بہت خوب صورت حقیقت ہے جیون کی' جس کو جیا جا سکتا ہے' جانا جا سکتا ہے' مگر دشواری ہے تو بس یہی کہ اس کا متعین معنی کیوں کر بیان ہو۔ انسان کی بدقسمتی تو یہی ہے کہ جس کو اسے ایماندارانہ جینا چاہیے' جس کا ادراک ہونا چاہیے اس کے متعلق انسانیت گزشتہ چار سے پانچ ہزار برسوں کے دوران میں محض باتیں ہی باتیں کرتی رہی ہے۔ محبت پر باتیں ہوتی ہیں' محبت بھرے گیت گائے جا رہے ہیں' معبدوں اور گرجوں میں وفائیہ تحریں گائی گئی ہیں' اور کیا کچھ ہے جو محبت کی تحسین میں نہیں کہا گیا ہے اس کے باوجود انسانی زندگی میں محبت کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ اگر ہم انسان کا کھرا مطالعہ کریں تو انسانی زبان میں محبت سے زیادہ کاذب لفظ نہیں ملے گا۔

مذہب محبت کے متعلق نغمہ سرا ہے مگر جس نوع کی محبت عام ہو رہی ہے ...... جس نے انسانیت کو ایک موروثی بدقسمتی میں محصور کر دیا ہے ...... صرف ایک مقصد

کو پانے میں کامیاب رہی ہے اور وہ ہے انسانی زندگی میں محبت کے سب دروازے بند کر دینا۔ ستم تو یہ ہے کہ عوام کی اکثریت ان رہنماؤں کو پوجتی ہے جنہوں نے محبت کی تکذیب کی ہے' جنہوں نے محبت کی دھارا کو جوہڑ بنا ڈالا ہے۔ اس اعتبار سے خواہ کوئی مشرقی ہو یا مغربی' ہندوستانی ہو یا امریکی ان کے اس رجحان میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہے۔ بہرکیف محبت انسانی زندگی میں اب تک تو ظہور نہیں کر سکی۔ ہم اس کا ذمہ دار انسان کو ٹھہراتے ہیں۔ ہم ایسا اس لئے کہتے ہیں کیونکہ انسان برباد ہوا ہے' محبت بہرکیف نمود نہیں پا سکی۔ ہم اس کا الزام ذہن کو دیتے ہیں کہ چونکہ ہمارا ذہن مسموم ہے لہٰذا محبت نمود نہیں پا سکی۔ ذہن مسموم نہیں ہے۔ جو لوگ محبت کو مسموم کرنے پر ذہن کو مطعون کرتے ہیں دراصل یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے محبت کی کونپل ہی پھوٹنے نہیں دی۔ اس دنیا میں کوئی شے مسموم نہیں ہے۔ خداوند عظیم کی تمام تخلیقات میں کوئی بھی شے اس قدر بری نہیں ہے بلکہ ہر شے نقطار ہے' جو دیوی' دیوتاؤں کا زندگی اور حسن عطا کرنے والا مشروب ہے۔ یہ صرف اور محض انسان ہے جس نے نقطار سے بھرے ہوئے برتن کو زہر میں بدل ڈالا ہے۔ اس جرم کا ارتکاب کرنے والوں میں سب نام نہاد معلم' مقدس لوگ' ولی اور واعظ شامل ہیں۔

میرے نزدیک اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کرنا بہت ضروری ہے۔ اگر اس مرض کو سمجھا نہ گیا' اس معاملے کو آج ہی واضح طور پر درست نہ کیا گیا تو انسانی زندگی میں محبت کا آئندہ کوئی امکان نہیں ہو گا۔ ستم تو یہ ہے کہ ہم نے اسی سرچشمے کو علت تسلیم کر لیا ہے جس کی وجہ سے انسانی افق پر محبت کا سورج طلوع نہیں ہوا۔ اگر انہی گمراہ کن اصولوں کو بااصرار صدیوں دہرایا جاتا رہا تو حقیقی اصولوں کی جو بنیادی تکذیب ہوتی ہے اس کو جاننے میں ہم ناکام ہو جائیں گے۔ غیر فطری مذہبی فرائض پر عمل درآمد میں انسان کی باطنی نااہلی کے سبب ہی سے انتشار نے جنم لیا ہے۔ لہٰذا دکھائی تو یہی دیتا ہے کہ انسان غلطی پر ہے۔

اس بات کی مزید تفصیلی وضاحت اس کہانی کے ذریعے کرتا ہوں۔ میں نے سنا ہے

کہ پرانے زمانے میں ایک دستی پنکھوں کی پھیری والا بادشاہ کے محل کے نزدیک سے گزرا کرتا تھا۔ وہ اپنے پنکھوں کے متعلق آواز لگاتا تو یہ کہتا: "لاثانی اور حیران کن پنکھے خریدو۔" "ایسے پنکھے کبھی بنائے گئے ہیں نہ کبھی کسی نے دیکھے ہیں۔" یہ اس کا دعویٰ تھا۔

بادشاہ کو دستی پنکھے جمع کرنے کا شوق تھا۔ اس نے ساری دنیا سے ہر قسم کے پنکھے اکٹھے کر رکھے تھے۔ ایک دفعہ اس نے پھیری والے کی آواز سنی تو بڑا متجسس ہوا۔ اس نے محل کی بالکونی سے اس "لاثانی وحیران کن" پنکھوں اور ان کے بیچنے والے کو دیکھا۔ بالکونی سے اسے وہ پنکھے بہت گھٹیا، عام سے اور بہت معمولی نظر آئے۔ تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اور حقیقت حال سے آگاہی کے لئے بادشاہ نے حکم دیا کہ پھیری والے کو اوپر اس کے حضور پیش کیا جائے۔

بادشاہ نے اس سے پوچھا: "ان پنکھوں کی کیا انفرادیت ہے؟ اور ان کی قیمت کیا ہے؟"

پھیری والے نے کہا: "جہاں پناہ! ان پنکھوں کی قیمت ان کی خوبی کے مقابلے میں انتہائی کم ہے یہ ایک پنکھا ایک سو روپے کا ہے۔"

یہ قیمت سن کر بادشاہ حیران ہوا۔ وہ بازار میں ہر کہیں ایک پیسے میں ایک بکنے والے پنکھوں کی قیمت ایک سو روپے میں ایک سن کر حیران ہوا تھا۔ اس نے پھیری والے سے استفسار کیا اور پوچھا: "ان پنکھوں کی ایسی کون سی خصوصیت ہے کہ تم انھیں اتنا قیمتی بتا رہے ہو؟"

پھیری والے نے کہا: "حضور والا! ان پنکھوں کی بے مثال صفت یہ ہے کہ یہ ایک صدی تک چل سکتے ہیں۔ ایک سو سال میں یہ بالکل بھی خراب نہیں ہوں گے۔"

بادشاہ یہ لاف وگزاف سن کر ناراض ہو گیا۔ اس نے سختی سے پوچھا: "کیا تم مجھے بے وقوف سمجھتے ہو؟ تم مجھ سے کھلا مذاق کر رہے ہو۔ دیکھنے میں تو یہ پنکھے ایک ہفتے

بعد ہی بے کار ہوتے نظر آرہے ہیں اور تم ایک صدی کا دعویٰ کر رہے ہو؟ کیا تم بادشاہ سے بھی عیاری کرو گے؟

پھیری والا بادشاہ کے اشتعال کے باوجود بھی بے خوفی سے بولا: "اے میرے آقا! میں آپ کو دھوکا دینے کی جسارت کیوں کر سکتا ہوں آپ انھیں خریدیے اور پرکھیے۔ میں روزانہ یہیں گلیوں بازاروں میں پھیری لگاتا ہوں۔ میں دھوکا دے کر کہاں جا سکتا ہوں۔ آپ تو سارے ملک کے مالک ہیں، مجھے آپ سے دھوکا کر کے کہاں پناہ ملے گی؟"

یہ سن کر بادشاہ کا موڈ ٹھیک ہوا اور اس نے وہ منہ مانگی قیمت دے کر پنکھے خرید لئے۔ درحقیقت بادشاہ اب بھی پھیری والے کے دعووں پر یقین نہیں کر رہا تھا تاہم تجسس کی تسکین کے لئے اس نے پنکھے خریدے تھے ورنہ یہ تجسس اسے مارے ڈال رہا تھا کہ آخر کن بنیادوں پر پھیری والا یہ سفید جھوٹ بولے جا رہا ہے۔ اس نے حکم دیا کہ پھیری والا سات دن بعد حاضر ہو۔

تین دن بعد پنکھے کے درمیان والی ڈنڈی ٹوٹ گئی، ہفتہ گزرنے سے پہلے پہلے پنکھا بکھر کے رہ گیا۔ اس پر بادشاہ کو یقین ہو گیا کہ پھیری والا اب نہیں آنے والا۔ لیکن ساتویں دن وہ سخت حیران ہوا جب پھیری والا عین وقت پر حاضر ہو گیا۔

"میرے آقا! میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔"

بادشاہ کا پارہ چڑھ گیا، وہ سخت مشتعل تھا: "شیطان آدمی! بے وقوف!! دیکھو وہ پڑے ہیں تمھارے پنکھے ...... ٹوٹے ہوئے۔ ان کی یہ حالت صرف ایک ہفتے ہی میں ہو گئی ہے اور تم دعویٰ کرتے تھے کہ یہ ایک صدی تک چلیں گے۔ یا تو تم پاگل ہو یا عیاروں کے سردار ہو؟"

پھیری والا بڑے عجز سے بولا: "جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ حضور یہ پنکھے تو لازماً ایک صدی چلیں گے۔ شاید بادشاہ سلامت کو ان کے طریقہ استعمال کے بارے میں نہیں پتا۔ کیا آپ بتانا پسند فرمائیں گے کہ آپ نے پنکھا کس طرح استعمال کیا؟"

بادشاہ کا غصہ بڑھ گیا' اس نے کہا: "خدا کی پناہ' اب تم مجھے پنکھا استعمال کرنا سکھاؤ گے؟"

پھیری والے نے کہا: "حضور والا! خفا مت ہوں۔ میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ پنکھوں کی یہ حالت سات دنوں میں کیوں کر ہوئی لہٰذا آپ مہربانی فرما کر بتایئے کہ آپ نے پنکھوں کو کس طرح استعمال کیا تھا؟"

بادشاہ نے آخرکار اس کی التجاؤں سے پسیج کر ایک پنکھا اٹھایا اور دکھایا کہ اس نے کس طرح انھیں استعمال کیا تھا۔ پھیری والا جوش کے ساتھ بولا: "میں سمجھ گیا۔ اب مجھے غلطی کا علم ہو گیا ہے۔ پنکھے کو اس طرح استعمال نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

بادشاہ کے غصے میں اضافہ بھی ہوا اور حیرت بھی ہوئی' اس نے پوچھا: "کیا اس کے علاوہ بھی پنکھے استعمال کرنے کا کوئی طریقہ ہے؟"

پھیری والے نے وضاحت کی: "ہاں سرکار! ایک پنکھا تھامئے' اسے اپنے سامنے مضبوطی سے رکھئے اور اپنے سر کو دائیں بائیں ہلایئے ...... پنکھا ایک صدی تک چلے گا۔ خاکم بدہن آپ گزر جائیں گے لیکن پنکھا کارآمد رہے گا۔ پنکھے میں تو کوئی خامی نہیں ہے۔ آپ کا طریق استعمال درست نہیں ہے۔ آپ نے سر کو بے حرکت رکھا اور پنکھے کو ہلایا۔ بھلا بتایئے اس میں میرے پنکھے کا کیا قصور ہے؟ غلطی تو حضور کی ہے میرے پنکھے میں تو کوئی خرابی نہیں۔"

انسان اور انسانیت کو بالکل ایسے ہی جرم کا مرتکب قرار دیا گیا ہے! ...... ہماری انسانیت کو دیکھو۔ انسان سخت بیمار ہے ...... جو نتیجہ ہے پانچ' چھ یا دس ہزار برسوں کا۔ یہ مسلسل باور کروایا گیا ہے کہ انسان غلط ہے' تہذیب درست ہے۔ انسان برباد ہو رہا ہے' تہذیب کی تحسین ہو رہی ہے۔ ہماری عظیم تہذیب! ہمارا عظیم تر مذہب! ...... ہر شے عظیم ہے اور ذرا ان کے ثمرات تو دیکھو!

لیکن وہ کہتے ہیں انسان غلط ہے' انسان کو خود کو بدلنا چاہیے اور کوئی نہیں جو انسانوں کے ہجوم سے نکلے اور سوال کرے کہ کیا یہ تہذیب اور مذہب ہی نہیں ہیں

جنھوں نے جھوٹی اقدار سے معمور گزشتہ دس پندرہ برسوں میں انسان کو محبت سے خالی رکھا ہے؟

اور اگر محبت گزشتہ دس ہزار برسوں میں نمود نہیں پا سکی تو پھر مجھ سے سنو کہ آئندہ بھی اس کا کوئی امکان نہیں ہے کہ اس تہذیب اور مذہب کی اساس پر کسی محبت کرنے والے کا ظہور ہو سکے۔

جو کچھ گزشتہ دس ہزار برسوں میں حاصل نہیں کیا جا سکا وہ آئندہ دس ہزار برسوں میں بھی حاصل نہیں ہو گا کیونکہ انسان کل بھی وہی ہو گا جو آج ہے۔ گو کہ رسمی ادب آداب' تمدن اور ٹیکنالوجی کی ملمع کاری اسے ہر دور میں نیا ظاہر کرے گی۔

انسان جیسا تھا ویسا ہی ہے اور ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ لیکن ہم تہذیب اور مذہب پر نظرثانی کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔ جس کے متعلق ہم اور ہمارے وہ ولی اور سرپرست جن کے پاؤں ہم چومتے ہیں' بلند آواز میں گیت گاتے ہیں۔ اگر وہ سب غلط نہیں ہیں' اگر وہ گمراہ نہیں کر رہے تو اس کی تصدیق کے لئے اپنی سوچ کی سمتوں اور راہوں پر نظر ڈالنے اور غور و فکر کے لئے آمادہ کیوں نہیں ہوتے۔

میں تمہیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ بنیاد ہی کج ہے' اقدار باطل ہیں۔ اس کا ثبوت آج کا انسان ہے۔ کیا اس کا کوئی دوسرا ثبوت ہو سکتا ہے؟ ...... ہم ایک بیج بوتے ہیں اور اس کا ثمر مسموم اور تلخ ہو تو کیا نتیجہ اخذ کرتے ہیں؟ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ضرور بیج مسموم اور تلخ رہا ہو گا ...... لیکن' ہاں یہ پیش گوئی مشکل ہے کہ ایک مخصوص بیج تلخ پھل دے گا یا نہیں۔ البتہ تم اس کا مشاہدہ کر سکتے ہو' اس کو ہر طرف سے دیکھو' اسے دباؤ' اسے توڑو' لیکن تم اس کے متعلق یقینی پیش گوئی نہیں کر سکتے کہ اس کے پھل میٹھے ہوں گے یا نہیں۔ اس کے لئے تمہیں وقت کی پرکھ کا انتظار کرنا ہو گا۔

ایک بیج کو بوؤ۔ ایک پودا اگے گا۔ برس گزریں گے تب ایک درخت ظاہر ہو گا اور نشوونما پا کر بڑھتا جائے گا' فضا میں اس کی شاخیں پھیلیں گی' ان پر پھل لگیں گے

اور تب ہی تم جان پاؤ گے کہ جو بیج بویا گیا تھا وہ تلخ تھا یا نہیں۔

جدید انسان تہذیب اور مذہب کے ان بیجوں کا پھل ہے جو گزشتہ تقریباً" دس ہزار برسوں میں بوئے اور پروان چڑھائے گئے ہیں۔ اور یہ پھل تلخ ہے' مناقشوں سے اور المیوں سے معمور ہے۔ مگر ہم ہی ان بیجوں کی حمد وثنا کرتے ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ ان سے محبت کے گلاب آگیں گے۔ ایسا کچھ نہیں ہونے والا' میں دوبارہ کہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ محبت کی پیدائش کا بنیادی امکان ہی مذہب نے ختم کر دیا ہے' یہ مسموم ہو چکا ہے۔ محبت کو انسانوں سے بڑھ کر ان پرندوں' جانوروں اور پودوں میں دیکھا جا سکتا ہے جن کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ کوئی تہذیب۔ غیرتہذیب یافتہ انسانوں اور پسماندہ بن باسیوں میں آج کے نام نہاد ترقی پسند' مہذب اور متمدن انسانوں کے مقابلے میں زیادہ محبت دیکھی جا سکتی ہے۔ اور ہزار نہ مانو تو کہوں کہ قدیم نسل کے انسان کسی طرح کے تمدن' تہذیب یا مذہب کے حامل نہیں تھے۔ آخر کیوں انسان جس قدر متمدن' مہذب اور مذہبی ہوتا گیا اسی قدر وہ رفتہ رفتہ محبت کے حوالے سے بنجر ہوتا گیا؟

اس کی کچھ وجوہات ہیں اور میں ان پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ اگر انہیں سمجھ لیا گیا تو محبت کی لامختتم دھارا پھوٹ بہے گی۔ لیکن اسے تو پتھروں سے یوں مسدود کر دیا گیا ہے کہ یہ رواں ہو ہی نہیں سکتی۔ اس کو ہر طرف سے پلستر کر دیا گیا ہے سو مقدس دریائے گنگا آزادی سے بہنے کے لئے رواں نہیں ہو سکتا۔

محبت تو انسان کے بطون میں ہوتی ہے۔ اسے خارج سے درآمد نہیں کیا جاتا۔ یہ روزمرہ استعمال کی شے نہیں جسے ہم کہیں بھی بازار سے جا کر لا سکتے ہوں۔ یہ زندگی کی خوشبو جیسی ہے' یہ ہر شخص کے اندر ہوتی ہے۔ سو محبت کی تلاش' محبت کو پانے کی جدوجہد کوئی مثبت عمل نہیں ہے یا کسی جگہ جا کر پا لینے کا عمل بھی درست نہیں میں اس بات کو درج ذیل حکایت سے واضح کرتا ہوں۔

ایک مجسمہ ساز چٹان توڑ رہا تھا۔ ایک شخص نے' جو مجسمے کی تخلیق کا نظارہ کرنے

وہاں آیا ہوا تھا' دیکھا کہ یہاں تو مجسمے کا کوئی نشان تک نہیں ہے۔ صرف ایک پتھر ہے جسے چھینی اور ہتھوڑے کی مدد سے ادھر ادھر سے تراشا جا رہا ہے۔ اس آدمی نے دریافت کیا: "تم کیا کر رہے ہو؟ کیا تم مجسمہ تخلیق نہیں کر رہے؟ میں تو آیا تھا کہ دیکھوں مجسمہ کیسے بنتا ہے' لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تم تو بس ایک پتھر ہی کو تراشنے میں لگے ہو۔"

فن کار نے کہا: "مجسمہ تو اس کے اندر ہے۔ اس کو بنانا ضروری نہیں ہے۔ محض پتھر کی بے کار کثافت کو جس نے مجسمے کو ڈھانپ رکھا ہے' ہٹانا ضروری ہے۔ یہ کثافت دور ہوتے ہی مجسمہ اپنی لطافت عیاں کر دے گا۔ کوئی مجسمہ بنایا نہیں جاتا' اسے تو دریافت کیا جاتا ہے۔ اسے تو پردے سے نکالا جاتا ہے' روشنی میں لایا جاتا ہے۔" محبت انسان کے اندر بند ہے صرف اسے کھولنا ہوتا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ محبت کو تخلیق کرنا ہے۔ اصل سوال اس کو پردے سے باہر نکالنے کا ہے۔ مگر یہ سب کچھ جس سے ہم نے خود کو ڈھانپ رکھا ہے' یہی تو ہے جو اسے عیاں نہیں ہونے دیتا۔۔۔۔۔۔۔ کسی میڈیکل پریکٹشنر سے پوچھنے کی کوشش کرو کہ صحت کیا ہے؟ ۔۔۔۔۔۔ یہ ایک نہایت عجیب حقیقت ہے کہ دنیا کا کوئی ڈاکٹر ایسا نہیں ہے جو بتا سکے کہ صحت کیا ہے!

اگرچہ تمام تر میڈیکل سائنس صحت پر ہی مدار کرتی ہے' تاہم کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو یہ بتانے کے قابل ہو کہ صحت کیا ہے؟ اگر تم کسی ڈاکٹر سے پوچھو تو وہ کہے گا کہ وہ تمہیں یہ تو بتا سکتا ہے کہ بیماریاں کیا ہیں اور ان کی علامات کیا ہیں۔ وہ ہر ہر مرض کے لئے مختلف ٹیکنیکل اصطلاحات سے آگاہ ہو گا۔ وہ دوا بھی تجویز کر سکتا ہو گا۔۔۔۔۔ مگر صحت؟ ۔۔۔۔۔۔ صحت کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا ہو گا۔ وہ صرف اتنا بیان کر سکتا ہے کہ جب کوئی بیماری نہ ہو تو جو کیفیت ہوتی ہے اسے صحت کہا جاتا ہے۔

ایسا اس لئے ہے کہ صحت انسان کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے' انسان اس کی تعریف

متعین نہیں کر سکتا۔ بیماری باہر سے آتی ہے لہٰذا اس کی تعریف متعین کی جا سکتی ہے۔ صحت تعریف کو خاطر میں نہیں لاتی۔ ہم صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ بیماری کی عدم موجودگی صحت ہے۔ گو یہ درست ہے لیکن کیا یہ صحت کی متعین تعریف ہو سکتی ہے؟ صحت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بیماری کی عدم موجودگی کے متعلق بتایا جاتا تو بیماری کی بابت بتاتا ہوا نہ کہ صحت کے بارے میں۔

سچ تو یہ ہے کہ صحت تخلیق نہیں کی جا سکتی۔ یا تو یہ بیماری کی وجہ سے چھپی ہوتی ہے یا پھر اگر بیماری دور ہو جائے تو یہ خود کو ظاہر کرتی ہے۔ صحت ہمارے اندر ہے' صحت ہماری فطرت ہے۔

محبت ہمارے اندر ہے۔ محبت ہماری موروثی فطرت ہے۔ یہ امر بنیادی طور پر غلط ہے کہ انسان کو محبت کی تخلیق کہا جائے۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ محبت کو تخلیق کیا جائے بلکہ مسئلہ گہرائی میں جا کر اس کو باہر لانے کا ہے اور یہ کہ آخر محبت اپنی نمود پر قادر کیوں نہیں ہے؟ آخر رکاوٹ کیا ہے؟ مشکل کیا ہے؟ آخر اس کے آگے بندھا ہوا بند کہاں ہے؟ اگر رکاوٹیں کہیں نہیں ہیں تو محبت خود کو ظاہر کر دے گی۔ یہ لازم نہیں کہ اسے ترغیب فراہم کی جائے۔

اگر جھوٹی تہذیب اور تذلیل کرنے والی' نقصان دہ روایات کی حد بندیاں نہیں ہوں گی تو ہر انسان محبت سے لبریز ہو گا۔ کوئی شخص بھی محبت کو دبا نہیں سکتا' یہ تو ناگزیر ہے۔ محبت تو ہماری فطرت ہے۔

گنگا ہمالیہ سے رواں ہوتی ہے۔ یہ پانی ہے' یہ طاقت ور ہے' اسے تو بہنا ہے۔ یہ کسی رہنما کو نہیں پوچھتا۔ یہ کسی پروہت کو نہیں پوچھتا جو اسے سمندر کا راستہ دکھائے۔ کیا تم نے کبھی کوئی دریا دیکھا ہے کسی کراس روڈ پہ کسی سپاہی سے سمندر کا حدود اربعہ دریافت کرتے ہوئے؟

یہ ٹھیک ہے سمندر کہیں دور پرے ہو سکتا ہے۔ سمندر نظر سے نہاں ہو سکتا ہے بہر حال دریا یقیناً راستہ پا لے گا اس کو کہتے ہیں ناگزیریت۔ یہ ہوتی ہے داخلی تمنا۔

دریا کے پاس کوئی گائیڈ بک نہیں ہوتی لیکن اپنی منزل پر حتمی طور پر پہنچ جاتا ہے۔ یہ پہاڑوں کو توڑ دے گا' میدانوں کو عبور کرے گا' ملک کے پار چلا جائے گا' اور یوں سمندر تک دوڑتا چلا جائے گا کیونکہ ایک بے انت خواہش' ایک زور اور توانائی اس کے بطون باطن میں پنہاں ہے۔ لیکن فرض کیا اگر انسان اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دے؟ اگر انسان بند باندھ دے؟ ایک دریا فطری رکاوٹوں پر تو غلبہ پا سکتا ہے' ان سے کامیابی سے گزر سکتا ہے کیونکہ آخرکار فطری رکاوٹیں اس کے لئے رکاوٹ ثابت نہیں ہوتیں لیکن اگر انسان کی بنائی ہوئی رکاوٹیں کھڑی ہوں' انسان اس کے آگے انجینئرنگ سے ڈیم بنا دے تو ممکن ہے کہ دریا سمندر تک نہیں پہنچ پائے گا۔ صورت حالات کے اس واضح ترین فرق کو شناخت کیا جانا چاہیے۔ انسان' تخلیق کی عظیم ترین ذہانت' اگر فیصلہ کر لے تو دریا کو سمندر تک پہنچنے سے روک سکتا ہے۔

ہرگاہ فطرت میں ایک اساسی وحدت ہے' ایک ہم آہنگی ہے۔ فطرت میں جو رکاوٹیں' ظاہری مخالفتیں دکھائی دیتی ہیں درحقیقت توانائی کو ابھارنے والے چیلنج ہیں۔ فطرت میں قطعاً" کوئی عدم ہم آہنگی نہیں ہے۔ جب ہم بیج بوتے ہیں تو بظاہر ایسا لگتا ہے کہ زمین کی وہ تہہ جو بیج کے عین اوپر ہے اسے اندر کی طرف' نیچے کو دبا رہی ہے اور اس کی بڑھوتری میں رکاوٹ بن رہی ہے۔ بظاہر تو ایسا ہی دکھائی دیتا ہے لیکن حقیقتاً" زمین کی وہ تہہ رکاوٹ نہیں بن رہی ہوتی۔ اس تہہ کے بغیر بیج اُگ ہی نہیں سکتا۔ زمین بیج کو اس لئے دباتی ہے تاکہ وہ نرم ہو جائے اور پھوٹ کر خود کو ایک پودے میں ڈھال لے۔ بظاہر تو کچھ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ مٹی بیج کو ختم کئے دے رہی ہے لیکن مٹی تو محض ایک دوستانہ' ذمہ داری نبھا رہی ہوتی ہے۔

اگر کوئی بیج نشوونما پا کر پودا نہیں بنتا تو ہم توجیہہ کرتے ہیں کہ ہو سکتا ہے مٹی موزوں نہ ہو یا ہو سکتا کہ بیج کو کافی مقدار میں پانی نہ ملا ہو یا ہو سکتا ہے اسے سورج کی مناسب روشنی حاصل نہ ہوئی ہو۔ ہم بیج کو الزام نہیں دیتے ہیں۔ لیکن اگر انسان کی زندگی میں پھول نہ کھلیں تو ہم کہتے ہیں اس کا ذمہ دار خود انسان ہی ہے۔ کوئی بھی

محض اس طرح سے نہیں سوچتا کہ کھاد گھٹیا ہو گی یا پانی کمیاب ہو گا یا سورج کی روشنی قلیل ہو گی یا اس حوالے سے کچھ بھی اور ہونے کا نہیں سوچتے۔ اس معاملے میں صرف انسان ہی کو الزام دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کا پودا ارتقا نہیں پا سکا ہے' اسے معاندت نے دبا دیا ہے' وہ پھول بن کر کھلنے کے مقام تک پہنچنے کے قابل نہیں ہو سکا۔

فطرت ایک متناسب و موزوں ہم آہنگی ہے۔ انسان نے جو مصنوعیت اس پر مسلط کر دی ہے' اس کے آرپار جو انجینئرنگ کی ہے' مکینیکل علم جو اس نے عین بہاؤ میں پھینکا ہے ان سب نے مل کر کئی جگہوں پر رکاوٹیں کھڑی کر کے اس کے بہاؤ کو روک دیا ہے —— اور دریا کو قاتل بنا دیا گیا ہے' انسان برا ہے —— بیج مسموم ہے —— میں آپ کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کروانا چاہتا ہوں کہ اصل رکاوٹیں خود انسان کی اپنی کھڑی کی ہوئی ہیں۔ یہ رکاوٹیں انسان کی خود تخلیق کردہ ہیں۔ ورنہ محبت کا دریا آزادی سے بہہ سکتا تھا اور خداوند کے سمندر تک پہنچ سکتا تھا۔ اگر رکاوٹوں کو بلا امتیاز ہٹا دیا جائے تو محبت کا دریا رواں ہو سکتا ہے۔ محبت خداوند سے وصل کے لئے بلند ہو سکتی ہے' خداوند جو رفیع و عظیم ہے۔

انسان کی خود تخلیق کردہ یہ رکاوٹیں کیا ہیں؟ اول' سب سے نمایاں رکاوٹ ہے جنس کی مخالفت —— یعنی جذبے کی رسوائی۔ اس رکاوٹ نے انسان میں محبت کی پیدائش کے امکان کو برباد کر کے رکھ دیا ہے جبکہ یہ سادہ سی حقیقت ہے کہ جنس محبت کا نقطہ آغاز ہے۔ جنس محبت کی جانب سفر کی شروعات ہے۔ محبت کی گنگا کی گنگوتری' اصل و ابتدا' جنس ہے' جذبہ ہے۔ مگر ہر شخص اس سے معاندت برتتا ہے۔ ہر تہذیب' ہر مذہب ہر گرو' ہر غیب دان نے اس گنگوتری پر حملہ کیا ہے۔ یہ سرچشمہ' یہ دریا اب محدود تر ہو کر رہ گیا ہے۔ ہمیشہ شور و غوغا برپا رہا ہے کہ جنس گناہ ہے' لامذہبیت ہے' جنس تو زہر ہے۔ ہم کبھی یہ ادراک نہیں کرتے کہ جنس کی توانائی سفر کرتی ہے اور محبت کے سمندر تک پہنچ جاتی ہے۔ محبت جنس کی توانائی کی قلب ماہیت

ہے۔ محبت کے گلاب جنس کے بیج سے پھوٹتے ہیں۔

کوئلے کی مثال لو۔ جب تم کوئلے کی قلب ماہیت ہیرے کو دیکھتے ہو تو تمہیں ذرا بھی دھچکا نہیں لگتا۔ کوئلے اور ہیرے میں بنیادی عناصر یکساں ہوتے ہیں۔ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ حقیقت میں دونوں کے درمیان قطعاً" کوئی فرق نہیں ہے۔ کوئلہ ہزاروں برس کے عمل سے گزر کر ہیرا بن جاتا ہے لیکن کوئلہ کوئی اہمیت حاصل نہیں کرپاتا یہاں تک کہ جب اسے گھر میں رکھا جاتا ہے تو ایسی جگہ ذخیرہ کیا جاتا ہے جہاں مہمانوں کی نگاہیں اس پر نہ پڑ سکیں۔ جبکہ ہیرے گردن میں ڈالے جاتے ہیں' سینے پر آویزاں کئے جاتے ہیں تاکہ انہیں دیکھ سکے۔ کوئلہ اور ہیرا یکساں ہیں تاہم یہ ایک ہی عنصر کے سفر کے دو مقامات ہیں۔ لیکن کیا یہ داخلی تعلق دنیا بھر میں کہیں بھی واضح ہے؟ اگر تم کوئلے کے دشمن بن جاؤ' جو کہ بالکل فطری ہو گا کیونکہ پہلی نگاہ میں یہ تمہیں محض کالک ہی دکھائی دیتا ہے' تو اس کی ہیرے میں قلب ماہیت کا امکان ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ کوئلہ بذات خود ہیرے میں تبدیل ہو سکتا ہے لیکن ہم کوئلے سے نفرت کرتے ہیں چنانچہ ہر ارتقا کا خاتمہ کر دیتے ہیں۔

صرف جنس کی توانائی ہی گل محبت کی صورت کھل سکتی ہے لیکن ہر شخص بشمول انسان کے عظیم مفکرین' اس کے مخالف ہیں۔ یہ مخالفت بیج کو پھوٹنے سے روک دیتی ہے۔ محبت کا محل بنیادوں کے مرحلے ہی پر تباہ کر دیا جاتا ہے۔ جنس سے معاندت نے محبت کے امکان کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ کوئلے سے ہیرا بننے کی طاقت چھین لی گئی ہے۔ بنیادی طور پر غلط تصورات کی وجہ سے جنس کی قلب ماہیت' ارتقا اور قبولیت کے مراحل کا بغور مطالعہ کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ ہم کیسے اس کی قلب ماہیت کر سکتے ہیں جس کے دشمن ہم خود ہیں' جس کی مخالفت ہم خود کرتے ہیں' جس کے ساتھ ہم خود مسلسل جنگ آزما ہیں۔

انسان کو اس کی اپنی ہی قوت کے ساتھ جھگڑے میں جبراً" ملوث کر دیا گیا ہے۔ انسان کو جنس کی توانائی کے خلاف لڑنے' جنسی رجحانات کی مخالفت کرنے کی تعلیم دی

گئی ہے۔ ذہن زہر ہے سو اس کے خلاف لڑو۔ مگر ذہن انسان کے اندر ہے اور جنس بھی انسان کے اندر ہے' تاہم انسان سے توقع کی گئی ہے کہ وہ داخلی مناقشوں سے آزاد ہو۔ اس سے جو توقع کی گئی ہے وہ ہے اس کا ایک ہم آہنگ وجود میں ڈھلنا!

انسان کو لڑنا بھی ہے اور جھگڑوں کو سلجھانا بھی ہے۔ جیسا کہ تعلیم کیا گیا ہے۔ ایک طرف تو انسان کو پاگل بنا دو دوسری طرف اس کا علاج کرنے کے لئے پاگل خانے بھی کھولو۔ بیماری کے جرثومے بھی پھیلا دو اور ساتھ ہی بیماروں کی بحالی صحت کے لئے ہسپتال بھی تعمیر کرو۔

ایک اور اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ انسان کو جنس سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ جنس تو اس کی بنیاد ہے۔ وہ اسی کی بدولت ہی تو پیدا ہوا ہے۔ خدا نے جنس کی توانائی کو تخلیق کے نقطہ آغاز کے طور پر قبول کیا ہے۔ "عظیم انسان" اس کو گناہ کے طور پر لیتے ہیں جب کہ خدا بذات خود اس کو گناہ قرار نہیں دیتا۔ اگر خدا جنس کو گناہ کے مانند قرار دیتا ہے تو پھر اس دنیا میں' اس کائنات میں خدا سے بڑا گناہگار کوئی نہیں ہو سکتا۔

کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ پھول کا کھلنا دراصل جذبے کا اظہار ہے' ایک جنسی عمل ہے! ایک مور کامل شکوہ کے ساتھ رقص کرتا ہے اور شاعر اس پر گیت لکھتا ہے۔ ایک ولی بھی اسے دیکھ کر مسرت سے معمور ہوتا ہے۔ مگر وہ سب نہیں جانتے کہ یہ رقص بھی جذبے ہی کا کھلم کھلا اور بیساختہ اظہار ہے۔ یہ بھی بنیادی طور پر ایک جنسی عمل ہی ہے۔ وہ کون ہے جس کے لئے رقص کرتا ہوا مور خوشی محسوس کرتا ہے؟ مور اپنی محبوبہ' اپنی زوج کو بلا رہا ہے۔ محو پاپی ہو پی ہو گا رہا ہے' بلبل گیت گا رہا ہے۔ ایک بالغ انسان ایک نوجوان کی طرح شوخ ہو جاتا ہے' ایک نابالغ لڑکی ایک عورت بن جاتی ہے --- یہ سب کیا ہے؟ یہ کیا ڈرامہ (لیلا) ہے؟

یہ سب محبت کی' جنسی توانائی کی علامتیں ہیں۔ یہ سب جنس کی ہی قلب ماہیئت ہے۔ یہ محبت کا اظہار ہے۔ یہ سب توانائی سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہ جنس کو تسلیم کر رہے ہیں۔ ساری کی ساری زندگی ------ تمام افعال' رویے' رجحانات' تمام گل

فشانیاں اپنی نہاد میں جنسی توانائی ہیں۔ مذہب اور تہذیب انسان کے ذہن میں جنس کے خلاف زہر انڈیل رہے ہیں' ایک مناقشہ' ایک جنگ کھڑی کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ انسان کو اس کی اساسی توانائی ہی کے خلاف جنگ میں الجھا دیا گیا ہے اور چنانچہ وہ بودا اور عجیب الخلقت اور خام اور کھردرا ہو گیا ہے۔ محبت سے خالی اور معدومیت سے معمور!

جنس کے ساتھ عداوت نہیں دوستی کی جانی چاہیے۔ جنس کی فصل بہاراں کو مزید پاکیزہ رفعتوں تک پہنچانا چاہیے۔ کچھ دانا جب نوبیاہتا جوڑے کو مبارک دیتے ہیں دلہن سے کہتے ہیں: "خدا تمہیں دس بچے عطا کرے اور تمہارا خاوند گیارہواں بچہ بن جائے۔" اگر جذبے کی قلب ماہیئت ہو تو بیوی ماں بن جاتی ہے۔ اگر جنس شہوت پر غالب آ جائے تو محبت میں ڈھل جاتی ہے۔ یہ فقط جنسی توانائی ہے جو محبت کی طاقت بن کر گل فشاں ہو سکتی ہے۔ لیکن ہم نے انسان کو جنس کے خلاف نفرت سے بھر دیا ہے۔ اس کا بدیہی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ محبت کا پھول کھل ہی نہیں سکا کیونکہ یہ تو وہ صورت ہے جو آخر میں ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ صرف اسی وقت ممکن ہے کہ پہلے جنس کو تسلیم کیا جائے۔ سرگرم مخالفت کے سبب ہی سے محبت ابھر نہیں سکی۔ اس کے برعکس انسان کے شعور میں تلاطم پیدا کرتی ہوئی جنس کو "جنسیت" سے گدلا کر دیا گیا ہے۔ انسان کا ضمیر زیادہ سے زیادہ جنسی ہو رہا ہے۔ ہمارے گیت' نظمیں' پینٹنگز اور یہاں تک کہ معبدوں میں بے بتوں کے اجسام بھی درحقیقت جنسی مرکز ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارا ذہن بھی جنس کے محور کے گرداگرد گھوم رہا ہے۔ دنیا میں کوئی جانور ایسا نہیں ہے جو انسان کی طرح جنسی ہو! انسان جنسی ہے' ہر جگہ' ہر کہیں' خوابیدہ یا بیدار' اخلاق میں اور ادب آداب میں بھی۔ ہر ہر لحہ جنس اسے ورغلاتی ہے۔

معاندت' مخالفت اور جبر کی وجہ سے انسان اندر سے مرجھا چکا ہے' خزاں زدہ ہے۔ وہ اس سے' جو زندگی کی جڑ بنیاد ہے' آزاد نہیں ہو سکا لیکن اس کے داخل میں برپا مستقل مناقشوں نے اس کے مکمل وجود کو چوراتی بنا دیا ہے۔ وہ بیمار ہے۔ عالم

انسانیت میں جنسیت کے اس بے محابا سیلاب کا باعث نام نہاد رہنما اور واعظ ہیں۔ ان لوگوں کو اس کا ملزم ٹھہرایا جانا چاہیے۔ جب تک انسان خود کو ایسے معلموں، واعظوں، سرپرستوں، پیش روی کرنے والوں اور ان کے جعلی پندونصائح سے آزاد نہیں کروالیتا۔ محبت کے ظہور کا امکان معدوم ہی رہے گا۔

مجھے ایک کہانی یاد آرہی ہے جو یوں ہے کہ ایک غریب دہقان ایک اتوار کو اپنے گھر سے نکلا۔ دروازے پر ہی اسے اپنا بچپن کا ایک دوست ملا جو اس سے ملاقات کرنے کے لئے ہی آرہا ہوتا ہے۔ دہقان کہتا ہے: "خوش آمدید! تم اتنے عرصے سے کہاں تھے؟ ------ تشریف لے آؤ ------ لیکن ------ میں نے کچھ دوستوں سے آج ملاقات کا وعدہ کیا ہوا ہے۔ اس وعدے کو توڑنا میرے لئے ممکن نہیں۔ براہ مہربانی تم ذرا گھر میں آرام کرو۔ میں بس ایک گھنٹے میں واپس آجاؤں گا۔ میں جلد ہی لوٹ آؤں گا اور پھر ہم طویل گپ شپ کریں گے۔"

دوست بولا: "اوہ" نہیں پیارے! کیا یہ بہتر نہیں رہے گا کہ میں تمہارے ساتھ ہی چلا چلوں؟ میرے کپڑے میلے ہیں ------ اگر تم مجھے صرف ایک دھلا ہوا جوڑا دے دو تو میں کپڑے بدل کر تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ ہم اتنے عرصے بعد ملے ہیں، میں زیادہ سے زیادہ وقت تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔

وہ دہقان بھی اپنے بچپن کے دوست سے اتنی مدت بعد مل کر بے حد خوش ہوا تھا اور خود بھی اسے زیادہ وقت دینا چاہتا تھا۔ اسے دوست کی یہ بات بہت پسند آئی۔ اس کو بادشاہ نے بہت پہلے کسی بات پر خوش ہو کر ایک انتہائی بیش قیمت لباس عطا کیا تھا۔ وہ لباس دہقان نے کسی اہم تقریب کے لئے محفوظ رکھا ہوا تھا۔ وہ خوشی خوشی وہی لباس اپنے دوست کے لئے نکال لایا تاکہ وہ اپنے میلے کپڑوں کی جگہ اسے زیب تن کر لے۔ دوست نے قیمتی کوٹ، پگڑی، دھوتی اور پرکشش جوتے پہن لئے۔ وہ تو بالکل بادشاہ جیسا لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر دہقان کو کسی قدر حسد محسوس ہوا۔ اس کے مقابلے میں خود دہقان اس کا ملازم نظر آرہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اس نے دوست کو اپنا

بہترین سوٹ دے کر غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ دہقان کو احساس کمتری نے گویا شکنجے میں جکڑ لیا۔

جب وہ دونوں گھر سے چلے تو ہر شخص شاندار لباس کی وجہ سے اس کے دوست کو دیکھتا تھا۔ دہقان کو اپنا آپ یوں محسوس ہونے لگا گویا وہ اسے محض ایک عام سا نوکر سمجھ رہے ہیں۔ اس احساس کے باوجود اس نے اپنے ذہن کو یہ کہہ کر ٹھنڈا کیا کہ وہ ایک شریف کسان ہے، خدا کا نیک بندہ ہے۔ اسے صرف خدا کے متعلق یا پھر اچھی اچھی باتوں کو سوچنا چاہیے۔ ویسے بھی ایک عمدہ کوٹ یا قیمتی پگڑی میں رکھا ہی کیا ہے؟ لیکن جتنا زیادہ وہ خود کو سمجھانے کی کوشش کرتا گیا اتنا ہی زیادہ اس کے ذہن پر پگڑی اور کوٹ کا خیال غلبہ پاتا گیا۔

اگرچہ وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے مگر راہ گیر صرف اس کے دوست ہی کو دیکھتے تھے۔ کوئی بھی تو دہقان پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ راہ گیروں کی اسے بے اعتنائی اور دوست کی پذیرائی سے دہقان کے اندر اضطراب بڑھتا چلا گیا۔ وہ بظاہر تو دوست سے باتیں کر رہا تھا لیکن اندرونی طور پر سوائے کوٹ اور پگڑی کے کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔

اسی الجھن اور اضطراب کے عالم میں وہ اس گھر پہنچ گئے جہاں دہقان نے وعدے کے مطابق آنا تھا۔ یہاں پہنچ کر اس کے اضطراب حسد اور احساس کمتری میں مزید اضافہ ہو گیا کیونکہ سبھی کی نظریں تحسین آفریں انداز میں اس کے دوست اور اس کے پہنے ہوئے کپڑوں پر جمی تھیں۔ اب دہقان اس کا تعارف کروانے لگا۔ اس نے کہا: "یہ میرا دوست ہے۔ بچپن کا دوست -- یہ بہت پیارا انسان ہے۔

اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس کے اندر کا آتش فشاں پھٹ پڑا اور لاوا یوں بہ نکلا: "اور یہ کپڑے؟ یہ میرے ہیں۔ ابھی جب یہ میرے ہاں آیا تو اس کے اپنے کپڑے بہت میلے تھے۔ اس کی درخواست پر میں نے بادشاہ کا عطا کردہ یہ لباس اس کو پہننے کے لئے دیا ہے۔"

یہ سن کر دوست تو شرم سے زمین میں گڑ گیا۔ وہ گھر والے بھی حیران ہوئے کہ یہ کیسا تعارف ہے' آخر لباس کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ادھر دہقان بھی فوراً ہی اپنی غلطی کا ادراک کر چکا تھا وہ اندر ہی اندر سخت شرمسار تھا۔ لیکن وہ لباس کی وجہ سے دوست کی مسلسل پذیرائی سے اتنا زیادہ مضطرب تھا کہ بے اختیار یہ جملے کہہ گیا۔ اب وہ شرمساری میں اپنے آپ کو دل ہی دل میں برا بھلا کہہ رہا تھا۔

خیر وہاں سے وہ لوگ روانہ ہوئے۔ گھر سے نکلتے ہی اس نے اپنے دوست سے معذرت کی۔ دوست نے کہا: "میں سخت حیران ہوں کہ تمہارے جیسے وضع دار آدمی اور بچپن کے دوست نے اس طرح کی بات کیسے کہہ دی؟ آخر تم نے ایسا کیوں کر کہا؟" دہقان سوائے اس کے کیا کہہ سکتا تھا کہ: مجھے معاف کر دو۔ یہ محض میری لغزش زبان تھی۔ میں اراد تاً" ایسا کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ مجھ سے غلطی ہو گئی ہے۔ مجھے اس پر بڑی شرمندگی ہے۔"

لیکن زبان کی لغزش کا کوئی جواز نہیں۔ زبان کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ منہ سے اکثر اوقات وہی کچھ نکل جاتا ہے جس کے لئے ذہن میں "کچھ" ہوتا ہے۔

وہ بولا: "مجھے معاف کر دو۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ کیوں کر ہو گیا۔" حالانکہ وہ خوب جانتا تھا کہ یہ تیر کس طرح ذہن کی کمان سے نکلا ہے۔

اب وہ ایک دوسرے دوست کے گھر کی طرف چل پڑے۔ اس دوران دہقان اندر ہی اندر طے کرتا آ رہا تھا کہ وہ اب کسی کو یہ نہیں بتائے گا کہ کپڑے اس کے ہیں۔ وہ اپنے ذہن کو مسلسل پکا کرتا جا رہا تھا۔ ذرا ہی سی دیر میں وہ جب اگلے دوست کے دروازے پر پہنچے تو وہ یہ پختہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ کسی کو نہیں بتائے گا کہ یہ کپڑے میرے ہیں۔

وہ پاگل آدمی اتنا بھی نہیں جانتا تھا کہ جس قدر وہ ذہن پر جبری فیصلے مسلط کرے گا اسی قدر اندرونی محسوسات مضبوطی سے جڑ پکڑیں گے کہ "وہی ان کپڑوں کا مالک ہے۔" مزید برآں سوچنے کی بات یہ ہے کہ پختہ فیصلے کب کئے جاتے ہیں؟ اس کو سمجھنے

کے لئے اس مثال کو دیکھئے۔ ایک آدمی جو کسی قسم کا پختہ عہد کرے۔ مثلاً کوئی عہد کرے کہ وہ ساری عمر مجرد گزارے گا تو اس کا یہ عہد کرنا ہی ثابت کر رہا ہے کہ اس کے اندر جنسیت کا بے پناہ دباؤ موجود ہے۔ ایک آدمی پختہ عزم کرے کہ آج سے وہ کم کھائے گا یا روزے رکھے گا تو اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ایسا عہد کرنے والے کے اند، ، ، حقیقت کھانے کی زبردست خواہش موجود ہے۔ پختہ عزم کرنے' پکے فیصلے کرنے اور عہد کرنے کی کوششوں کا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے۔۔ اور وہ ہے ایک ناگزیر داخلی مناقشہ! ہم دراصل وہی کچھ ہیں جو ہماری کمزوریاں ہیں!! ہم اپنی کمزوریوں کو جڑ سے اکھیڑنے کا فیصلہ کرتے ہیں' ان کے خلاف لڑنے کا پختہ عزم کرتے ہیں مگر اس کا فطری نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ہمارے تحت الشعور میں مناقشے جنم لیتے ہیں۔ اور کہانی والے دہقان کی بھی یہی حماقت اسے ذلیل کروا رہی تھی۔ وہ جس قدر اپنے کپڑوں کے متعلق بات نہ کرنے کا عزم کرتا تھا' حسد اور احساس کمتری اتنا ہی ان کی ملکیت کا احساس بڑھا دیتا۔ یوں اس کے اندر زبردست کشمکش برپا ہو گئی تھی' اور اس کا سبب اس کا اپنا پختہ عزم تھا۔

وہ دونوں نئے گھر داخل ہوئے۔ اب اس نے اپنے پیشگی فیصلے کے مطابق بڑے محتاط ہو کر تعارف کا آغاز کیا: "یہ میرا دوست ہے ..... " لیکن اتنا کہہ کر ہی اسے احساس ہو گیا کہ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں ہے۔ سب لوگ اس کے دوست کے شاندار لباس میں کھوئے ہوئے ہیں۔ یہ نظارہ اور اپنے استرداد کے احساس نے اس کے ذہن میں "میرا کوٹ میری پگڑی" کی گردان شروع کروا دی' مگر پختہ عزم کے تحت اس نے خود کو فوراً" ہی دل ہی دل میں سرزنش کی۔ "ہر آدمی ہر امیر و غریب کسی نہ کسی طرح کا لباس پہنتا ہی ہے۔ یہ کوئی اہم معاملہ نہیں ہے۔" وہ اسی طرح خود کو وضاحتوں سے بہلا رہا تھا مگر حقیقت پنڈولم کی طرح ادھر سے ادھر' ادھر سے ادھر اس کے اندر جھول رہی تھی۔ اس نے کسی قدر سنبھل کر تعارف کا سلسلہ جوڑا: "یہ میرا بچپن کا دوست ہے۔ یہ ایک بہت شریف آدمی ہے ---- اور ---- لباس؟ یہ تو اس کا اپنا ہے ---- میرا قطعی

نہیں۔" یہ سن کر سب لوگ حیران رہ گئے۔ انھوں نے کب کسی سے اس کے دوست کا اس طرح کا تعارف سنا تھا: "لباس اس کا ہے' میرا نہیں۔"

پہلے کی طرح اب کی بار بھی اسے فوری ندامت نے گھیر لیا۔ وہاں سے رخصت ہوئے تو اس نے پہلے سے بھی زیادہ لجاجت سے اپنے دوست سے معذرت کی۔ اس نے کہا" اس سے بڑی سخت غلطی سرزد ہوئی ہے۔ دراصل وہ بوکھلا گیا تھا کہ اسے کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا—— وہ خود حیران ہے کہ اسے کے ساتھ ہو کیا گیا تھا۔"

اس نے مزید کہا: "آج تک مجھے کسی لباس نے اس لباس کی طرح بے بس نہیں کیا ہے۔ اف میرے خدا! میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟" وہ بچارا خدا کو پکار رہا تھا۔ اسے اس حقیقت کا علم ہی نہیں تھا کہ جیسی خواہش اس کے اندر ہے اگر خدا کے اندر بھی ہوتی تو خدا بھی اس جتنا ہی بے بس ہوتا۔

اس کی معذرت' ندامت اور بے بسی کے باوجود دوست بہت برہم تھا۔ اس نے کہا کہ "اب وہ مزید کسی جگہ نہیں جائے گا۔ گھر واپس چل کر اس کے میلے کپڑے اسے لوٹا وئے جائیں۔ وہ ان شاہی کپڑوں کی وجہ سے مزید ذلت برداشت کرنے پر تیار نہیں۔"

یہ سن کر دہقان نے اس کے پاؤں پکڑ لئے اور کہا:" بخدا ایسا مت کرو۔ مجھے ساری زندگی رنج رہے گا کہ میں نے اپنے دوست کے ساتھ اتنے برے اخلاق کا ثبوت دیا۔ میں قسم کھاتا ہوں کہ اب کپڑوں کے متعلق کوئی بات نہیں کروں گا۔ یقین کرو میں دل سے قسم کھاتا ہوں بخدا میں کپڑوں کے متعلق مزید کوئی بات قطعاً" نہیں کروں گا۔
"

یہاں میں تمہیں بتاتا چلوں کہ تم میں سے ہر شخص کو ان لوگوں سے محتاط رہنا چاہیے جو اس طرح قسمیں کھاتے ہیں۔ ان کے اندر زیادہ گہری چالاکی نہاں ہوتی ہے۔ پختہ عزم تو اوپر والا ذہن کرتا ہے جبکہ تحت الشعور کی بھول بھلیوں میں اس کے بالکل الٹ بات موجود ہوتی ہے۔ وہ بات نہیں ہوتی جس کے بارے میں قسم کھائی گئی ہو۔

اگر ذہن کو دس حصوں میں تقسیم کیا جائے تو اس کا صرف ایک حصہ ہو گا جو پختہ عزم کرتا ہے جبکہ باقی نو کے نو حصے اس کے متضاد ہوتے ہیں۔ ذہن کا ایک حصہ تو تجرد کا عہد کر رہا ہوتا ہے جبکہ باقی نو حصوں میں اس جنس کا پاگل پن موجزن ہوتا ہے جو انسان میں خدا ہی نے بوئی ہے۔

لو اب ان دونوں کی بقیہ کہانی سنو۔ خفگی' معافی' قسموں' وعدوں کے بعد وہ تیسرے گھر پہنچے۔ اب دہقان نے خود کو بڑی سختی سے قابو کیا ہوا تھا۔ یاد رکھو خود پر اس طرح قابو پانے والے لوگ بڑے خطرناک ہوتے ہیں کیونکہ ان کے اندر ایک زندہ آتش فشاں موجود ہوتا ہے۔ وہ لوگ جو بظاہر حدبندیوں' ضابطوں کے پابند' خود پر قابو پائے ہوئے نظر آتے ہیں درحقیقت اندر سے بری طرح بے قابو ہوتے ہیں۔ اور مہربانی کر کے اس بات کو پلے باندھ لو کہ ایک جبری کامیابی کبھی مسلسل اور مکمل نہیں ہو سکتی کیونکہ اس بظاہر محتاط روی کے پس پردہ بہت زیادہ دباؤ موجود ہوتے ہیں۔ ناچار ہو کر تمہیں لازماً" کسی نہ کسی وقت سستانا ہو گا۔ تمہیں لازماً" آرام کرنا پڑے گا ---- کیونکہ آخر کب تک میں اپنی مٹھی کو سختی سے بند رکھ سکتا ہوں؟ چوبیس گھنٹے؟ ------ جتنا زیادہ سختی سے میں اپنی مٹھی بند کروں گا اتنا ہی تھکوں گا اور پھر اتنی ہی جلدی مٹھی کو کھولنا پڑے گا۔ اپنی توانائی کو جس قدر سخت محنت میں صرف کرو گے اتنی ہی جلدی تھک جاؤ گے' اس کا الٹا ردعمل ہو گا اور بڑی تیزی سے ہو گا۔ سیدھی سی بات ہے کہ ہتھیلی کو ہر وقت کھلا تو رکھا جا سکتا ہے لیکن ہر وقت بھینچا نہیں جا سکتا۔ ایک تھکن طاری کرنے والا معاملہ کبھی زندگی کا فطری راستہ نہیں ہو سکتا۔ اگر تم جبر کرتے ہو تو آرام یا ماندگی کا ایک وقفہ ضروری ہو گا۔ لہٰذا جتنا زیادہ کوئی صاحب تصرف ہو گا اسی قدر وہ خطرناک ہو گا۔ صحیفوں کے اصولوں کے مطابق اختیار کردہ ضبط نفس کے چوبیس گھنٹوں کے دوران میں اسے کبھی کبھار آرام کا ایک گھنٹہ لازماً" چاہیے ہو گا۔ آرام کے اسی مختصر وقفے کے دوران میں گناہوں کا ایک تلاطم برپا ہو گا اور وہ اپنے آپ کو جہنم کے بیچوں بیچ پائے گا۔

کہانی والے دہقان نے سختی کے ساتھ خود کو کپڑوں کے بارے میں گفتگو کرنے سے باز رکھنے کا تہیہ کر لیا۔ ذرا اس کی حالت کا تصور تو کرو۔ اگر تم تھوڑے سے بھی مذہبی آدمی ہو تو تم اس کی ذہنی حالت کے متعلق تصور کر سکتے ہو۔ اگر تم نے کبھی قسم کھائی ہے یا پختہ عزم کیا ہے یا کبھی خود پر مذہبی وجوہات سے قدغن لگائی ہے تو تم اس کے ذہن کی قابل رحم حالت کے متعلق اچھی طرح سمجھ لو گے --- وہ اندر داخل ہوئے۔ دہقان خود پر جبر کرتے ہوئے بری طرح تھک چکا تھا پسینے میں نچڑا ہوا تھا۔ ادھر دوست بھی متفکر تھا۔ اضطراب کی وجہ سے دہقان کے اعصاب بری طرح تنے ہوئے تھے۔ اس نے اسی کیفیت میں نئے میزبانوں سے بھی اپنے بچپن کے دوست کا تعارف کروانا شروع کیا۔ وہ بہت ٹھہر ٹھہر کے بول رہا تھا: "ملئے ------ میرے دوست ------ بہت ------ پرانے دوست ------ ہیں یہ بہت ------ عمدہ آدمی ہیں ------ یہ۔" اتنا کہہ کر اس نے لمحہ بھر ہی توقف کیا تھا کہ اس کے اندر سے ایک زبردست دباؤ ریلے کی طرح نکلا اور سب کچھ جو اس نے تہیہ کیا تھا' بہا کر لے گیا' اب وہ گویا بے اختیار ہو کر اونچی آواز میں بول اٹھا: "اور یہ کپڑے؟ ---- معاف کیجئے میں ان کے متعلق کوئی بات نہیں کروں گا کیونکہ میں نے قسم کھائی ہوئی ہے کہ ان کپڑوں کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتانا ہے۔"

اس دہقان کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہی کچھ پوری انسانیت کے ساتھ ہوا ہے۔ جنس ایک خبط' ایک مرض' ایک کج روی بن چکی ہے۔ یہ تہمتوں کے سبب مسموم ہو چکی ہے۔

بچوں کو عہد معصومیت ہی سے تعلیم دی جاتی ہے کہ جنس گناہ ہے۔ لڑکیوں کو خبردار کیا جاتا ہے' لڑکوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ جنس گناہ ہے۔ ایک لڑکی بڑی ہوتی ہے۔ ایک لڑکا جوان ہوتا ہے۔ بلوغت آتی ہے۔ ان کی شادیاں ہو جاتی ہیں۔ اور تب جذبوں میں ایک سفر آغاز ہوتا ہے' اس تیقن کے ساتھ کے ایک گناہ کی بنیاد جنس ہے ادھر یہ بھی ایک طرفہ تماشا ہے کہ لڑکی کو یہ بھی ذہن نشین کرایا جاتا ہے کہ اس کا

خاوند مجازی خدا ہے۔ وہ کیوں کر کسی ایسے شخص کو مجازی خدا مان کر اس کا احترام کرے جو اسے گناہ سے آلودہ کرتا ہے؟ لڑکے کو بتایا جاتا ہے کہ یہ لڑکی تمہاری بیوی' تمہاری دکھ سکھ کی ساتھی' تمہاری شریک حیات ہے۔ ادھر صحیفوں میں کہا گیا ہے کہ عورت دوزخ کا دروازہ ہے' گناہوں کی کھن ہے۔ گویا لڑکا شریک حیات کی شکل میں زندہ جہنم پاتا ہے۔ لڑکا سوچتا ہے: "کیا یہ میری نصف بہتر ہے؟ مکمل جہنم' گناہ نہاد نصف بہتر؟" ان سوالوں کی' ان تضادات کی موجودگی میں بھلا اس کی زندگی میں آہنگ کس طرح رونما ہو پائے گا؟ روایتی تعلیمات نے دنیا بھر میں ازدواجی حیات کو برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ جب شادی شدہ زندگی ہی متعصبانہ اور مسموم ہو گی تو محبت کا امکان کہاں!! اگر بیوی اور خاوند ہی ایک دوسرے سے محبت نہیں کر سکتے' جو کہ نہ صرف جبلی ہے بلکہ مکمل طور پر فطری بھی ہے' تو پھر ان سے دوسرا کون محبت کرے گا؟

یہ تشویش انگیز صورت حال' یہ پریشان کن محبت ستھری اور خالص ہو سکتی ہے۔ ان شریفانہ بلندیوں تک لے جائی جا سکتی ہے کہ تمام حدیں توڑ دے' تمام الجھنیں سلجھا دے اور ان کو خالص اور الوہی مسرت میں ڈبو دے۔ یہ رفعت ناممکن نہیں ہے۔ لیکن اگر اس کی کونپل پھوٹتے ہی اسے جڑ سے اکھیڑ کر پھینک دیا جائے' اس کا گلا گھونٹ دیا جائے' اسے مسموم کر دیا جائے تو خود بتاؤ اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ یہ کس طرح اعلیٰ ترین محبت کے گلاب کی شکل میں کھل سکے گی؟

اور آؤ اب میں تمہیں ایک تارک الدنیا درویش کی بصیرت افروز کہانی سناؤں۔ وہ درویش مست گھومتا پھرتا ہوا کسی بستی میں جا خیمہ نشین ہوا۔ اس کے پاس ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ وہ خدا کو جاننا چاہتا ہے۔

درویش نے پوچھا: "کیا تم نے کبھی کسی سے محبت کی ہے؟"

"نہیں میں نے کبھی کسی اس قسم کی غیر روحانی خطا نہیں کی۔ میں کبھی ایسی ذلتوں میں نہیں پڑا کیوں کہ میں خدا کو پانا چاہتا ہوں۔"

درویش نے دوبارہ پوچھا: "کیا تم کبھی کسی کی محبت میں مبتلا نہیں ہوئے ہو؟"

سائل نے پرزور انداز میں کہا: "میں نے آپ سے حقیقت ہی بیان کی ہے۔" وہ غریب تو واقعی ایمانداری سے ہی یہ بتا رہا تھا کیونکہ مذہب کی اقلیم میں محبت تو ایک عیب شمار ہوتی ہے۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ اگر اس نے بتایا کہ وہ کسی سے محبت کرتا ہے تو درویش کہے گا کہ اس کی رہنمائی حاصل کرنے کے لئے محبت سے فی الفور چھٹکارا پاؤ' چاہت چھوڑ دو اور غیر روحانی جذبات کو ترک کر دو۔ چنانچہ اگر وہ کسی سے محبت کرتا بھی تھا تو بھی اس نے جواب نفی ہی میں دیا۔ تم کوئی ایسا شخص مشکل ہی سے پاؤ گے جس نے کبھی کسی سے ذرا سی بھی محبت نہ کی ہو۔

اس درویش نے تیسری مرتبہ دریافت کیا: "مجھے کچھ تو بتاؤ۔ توجہ سے یاد کرو ---- تھوڑی ہی سہی' کسی سے بھی' کسی شخص سے بھی۔۔ کیا تم نے محبت کی ہے؟

وہ خدا کا متمنی و آرزو مند یوں گویا ہوا: "معذرت کے ساتھ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر آپ ایک ہی سوال بار بار کیوں پوچھ رہے ہیں؟ میں نے کبھی محبت کو دس فٹ لمبی لکڑی سے بھی نہیں چھوا کیونکہ میں تو اپنی ذات سے آگاہی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں خدا کے بندوں میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔"

یہ سن کر وہ درویش بولا: "میاں! تم مجھے معافی دو۔ جاؤ اور کسی اور سے ملو۔ میرا تجربہ تو یہی بتاتا ہے کہ اگر تم کسی سے بھی محبت کر چکے ہو' تھوڑی یا زیادہ' خواہ تم نے محبت کو فقط چکھا ہی ہو تو میں اسے توسیع دینے میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ میں اس کی اس حد تک نشوونما کے لئے رہنمائی دے سکتا ہوں کہ ممکن ہے یہ خدا کو پا لے۔ لیکن اگر تم نے کبھی محبت کی ہی نہیں ہے تو تم کبھی خود میں کچھ نہیں پا سکتے۔ تمہارے پاس بیج ہی نہیں ہے تو تم درخت کس طرح اگا سکتے ہو؟ لہٰذا تم جاؤ اور کسی دوسرے شخص سے رابطہ کرو۔ میرے دوست! میں نے تو محبت کے سوا خدا کا راستہ دیکھا ہی نہیں۔"

یہی معاملہ خاوند اور بیوی میں محبت کے ہونے اور نہ ہونے کا ہے۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ جو خاوند اپنی بیوی سے سچ محبت نہیں کرتا وہ اپنے بچوں سے محبت کرنے کا اہل

ہے تو تم افسوس ناک خطا کر رہے ہو۔ بیوی اپنے بیٹے سے محبت کرنے کے قابل تب ہی ہو سکتی ہے جب وہ اپنے خاوند سے محبت کرتی ہو۔ کیونکہ بیٹا اس کے خاوند ہی کا عکس ہے۔ اگر خاوند کے لئے محبت نہیں ہے تو بیٹے کے لئے محبت اس میں کیونکر ہو سکتی ہے؟ اور اگر بیٹے کی پرورش و پرداخت بغیر محبت کے ہو تو تم کیسے توقع کر سکتے ہو کہ وہ اپنے ماں باپ سے محبت کرے؟ ایک خاندان زندگی کی اکائی ہوتا ہے۔ دنیا فی نفسہ ایک بڑا خاندان ہے۔ لیکن جنس کی ملامت کر کے اس خاندان کی زندگی مسموم کر دی گئی ہے۔ اور اس پر ہم شور مچاتے ہیں کہ محبت کہیں دکھائی نہیں دیتی۔

دریں حالات تم کیوں کر توقع رکھتے ہو کہ محبت دکھائی دے گی۔ اگرچہ ہر شخص کہتا ہے کہ وہ محبت کرتا ہے۔ ماں' بیوی' بیٹا' بھائی' بہن' دوست ---- سب کہتے ہیں کہ وہ محبت کرتے ہیں۔ لیکن اگر تم مجموعی طور پر زندگی کو دیکھو تو تمہیں محبت کہیں نہیں ملے گی۔ اگر اتنے لوگ واقعی محبت کرتے ہوتے تو ہر سو محبت کی برسات ہوتی' محبت کا باغ پھولوں سے مہکتا اور مہکاتا ہوا ہوتا۔ کیا واقعی ہر گھر میں محبت کا چراغ روشن کیا گیا ہے؟ دنیا میں محبت کی کس قدر روشنی ہونی چاہیے تھی! لیکن اس کے بجائے ہم نفرت کو ہی روشنی اور سویرا بن کر مسلط پاتے ہیں۔ ایشیا کی اس معذرت خواہانہ سکیم میں محبت کی ایک کرن تک نہیں ہے۔ یہ محض ایک واہمہ ہے کہ محبت ہر جگہ موجود ہے۔ اور جب تک ہم اس مغالطے میں رہیں گے ہم حقیقت کی تلاش کا آغاز بھی نہیں کر سکیں گے۔ یہاں کوئی کسی سے محبت نہیں کرتا۔ اور جب تک فطری جنس کو بغیر تحفظات کے قبول نہیں کیا جاتا محبت بار نہیں پا سکتی۔ اس وقت تک جب تک کوئی کسی سے واقعی محبت نہیں کرتا انسانی زندگی اسی طرح ویران' بنجر' تاریک اور خوف سے بھری رہے گی۔ فطری جنس کے بغیر محبت کے تمام تر دعووں کے باوجود رشتے بے تعلقی کو فروغ دیتے رہیں گے۔ ایک ہی گھر' محلے' شہر اور دنیا میں رہنے والے انسان ایک دوسرے سے اجنبی' خوفزدہ' ملول اور مضطرب رہیں گے۔ محبت کو آزاد کراؤ۔ جنس کو تحفظات کی سلاخوں سے رہائی دلواؤ۔ واہموں سے نکلو روشنی میں

آؤ۔ صحیفوں میں درج تمسیوں' ڈراووں اور ہدایات سے صرف نظر کرو۔ ان سب نے گذشتہ ہزاروں برس میں تمھیں سوائے اداسی' کھوکھلے پن اور بے سکونی کے اور کیا عطا کیا ہے!

میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ بس اتنا ہے کہ جنس الوہی ہے۔ جنس کی برتر و اعلیٰ توانائی خدا کی عکاس ہے۔ یہ ناگزیر ہے کیونکہ اس میں ایک نئی زندگی تخلیق کرنے کی قوت ہے۔ اور یہ سب سے زیادہ پراسرار قوت ہے۔ یہ خدا کے اسرار میں سے ایک ہے۔ یہ نئی زندگی تخلیق کرنے کی قوت تمھارا الوہی اثاثہ ہے۔ یہ مقدس ہے۔ یہ قابل پرستش ہے۔ اس سے الجھو مت' اسے اپناؤ۔ اس سے مناقشہ مت کرو۔ اس سے صلح کرو۔ اس میں جیو۔ اگر تم زندگی میں محبت کی برسات دیکھنا چاہتے ہو تو جنس کے ساتھ مناقشے کو ختم کرنے کا اعلان کر دو۔ اسے بخوشی قبول کرو۔ اس کے تقدس کو تسلیم کرو۔ اس کو شکر گزاری کے ساتھ قبول کرو۔ اور مکمل طور پر اختیار کر لو۔ تم حیران رہ جاؤ گے جب جنسی شہوت تم پر اسی قدر تقدیس ارزاں کرے گی جس قدر پر تقدیس قبولیت تم اختیار کرو گے۔ ہاں یہ بات دھیان میں رہے کہ جس قدر تمھاری رسائی گناہ آلودہ اور نامحترم ہو گی اسی قدر مکروہ اور گناہ آلود جنس سے تمھارا سامنا ہو گا۔ جب کوئی شخص اپنی بیوی سے ملے تو اس طرح احساس تقدیس کے ساتھ ملے گویا وہ معبد کو جا رہا ہے۔ اسی طرح جب بیوی خاوند کے پاس جائے تو اسے احترام سے معمور ہونا چاہیے۔ یہ احترام واحساس تقدیس اس لیے اپنانا چاہیے کیونکہ محبت کرنے والے جنس کے عمل کے دوران میں' اختلاط کرتے ہیں اور یہ وہ مقام ہے جو خدا کے معبد سے نزدیک ترین ہے' جہاں وہ تخلیقی تموج میں جلوہ آرا ہوتا ہے ------ خدائی اس جلوہ آرائی کے مقام پر تمھاری جنسی قوت' تخلیق نو کی پراسرار قوت اپنے فطری رمز کو آشکار کرتی ہے ------ اور میرے فہم کے مطابق انسانی تاریخ میں انسان صرف دخول کے تجربے میں ہی سمادھی --- غیر ارادی مراقبے ---- کی اولین تابندہ جھلک دیکھتا ہے۔ انسان صرف اختلاط کے لمحوں میں ہی جان سکتا ہے کہ اتنی گہری محبت' اتنی

درخشندہ سعادت و مسرت ممکن ہو سکتی ہے۔ اور وہ لوگ جنھوں نے اس حقیقت پر' جنس اور اختلاط کے اس فینومنن (مظہر) پر درست زاویہ نگاہ سے دھیان دیا ہے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کلائمیکس کے لمحوں میں ذہن خیالات سے یکسر خالی ہو جاتا ہے۔ زندگی کا کون سے مرحلہ' عمر کا کون سا مقام ایسا ہے جہاں کسی شخص کا ذہن خیالات کے سیل بے پناہ کی زد میں کمزور کشتی کی طرح ہچکولے نہ کھاتا ہو۔ ہر لمحہ' ہر پل' ہر گھڑی انسان کے ذہن میں خیالات کی جوالا مکھی دہکتی رہتی ہے۔ چلتے پھرتے' کام کاج کرتے' سوتے جاگتے اور کچھ بھی نہ کرنے کی حالت میں ---- تم خیالات کو ذہن کے سب گوشوں میں فعال پاتے ہو۔ خیالات مسرت بخش کم اور اذیت دہ زیادہ ہیں۔ جو خوشی کی بجائے غم کی قبولیت اور اس کی فزونی کی زیادہ اہلیت رکھتے ہیں۔ یہ خیالات ہیں جو تمھاری یادیں ہیں' تمھارے خود کلامی تمھارے خیالات ہیں بغرض خیالات ذہن سے لے کر افعال تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ تم ہر لمحہ ہر کہیں ان کی گرفت میں ہو۔

اور یہ صرف جنسی اختلاط میں کلائمیکس کا لمحہ گزراں ہی ہے جہاں تم اس سعادت سے بہرہ ور ہوتے ہو کہ خیالات تمھارے ذہن سے بہہ جاتے ہیں۔ اور ذہن کا یہ خالی پن' یہ خلا' ذہن کا یہ انجماد خالص الوہی مسرت کی برسات کا سبب بنتا ہے۔ یہاں سے یہ رمز عیاں ہوتا ہے کہ اگر اس طرح سے ذہن کو خیالات سے آزاد کیا جا سکتا ہے تو مزید گہرائی سے غور کرنے پر کیا کوئی ایسا دوسرا عمل نہیں سوچا جا سکتا جس کے ذریعے شعور میں متلاطم خیالات کو ساکت کیا جا سکتا ہو' یہ سعادت حاصل کی جا سکتی ہو جو جنسی اختلاط میں کلائمیکس کے لمحے میں ارزاں ہوتی ہے۔

اور اسی نکتے سے یوگا کا نظام تخلیق ہوا۔ یوگا ایک سکون آفریں مراقبہ اور روح پرور عبادت ہے۔ ایک نئی تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ اختلاط کے بغیر بھی شعور کو منجمد کیا جا سکتا ہے۔ خیالات کی ہنگامہ آرائی کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ حیرت انگیز تناسب کی جو مسرت اختلاط کے عمل کے دوران میں حاصل ہوتی ہے وہی اختلاط کے بغیر بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ اختلاط کا عمل طبعی طور پر بس لمحاتی ہی ہو سکتا ہے کیونکہ اس کے دوران

میں قوت درجہ کمال پر ہوتی ہے' توانائی کا دھارا تیزی سے رواں ہوتا ہے۔ لہٰذا میں تمہیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ خالص مسرت' نفیس ترین محبت ---- خوب صورت تسکین' جو کسی یوگی کو ہمہ وقت حاصل رہتی ہے ایک جوڑا اس کو ایک یا کچھ زیادہ لمحوں کے لئے حاصل کر سکتا ہے' لیکن بنیادی طور پر دونوں کے مابین کوئی فرق و اختلاف قطعاً" نہیں ہے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے تاکہ وشے آنند' وہ جو حسی مسرت حاصل کرنے کی سعی کرتا ہے اور برہمانند' وہ جو برہما کو پانے کی سعی کرتا ہے' دونوں بھائی ہیں تو یہ اس نے بالکل درست کہا ہے۔ دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے بس فرق ہے تو اس قدر جس قدر زمین اور آسمان میں بلندی کا ہے!

اب اس مقام پر میں تمہیں پہلا اصول بتانا چاہتا ہوں۔ پہلا مطالبہ' پہلی اہلیت یہ ہے کہ تقدیس کو' الوہیت کو تسلیم کرو۔ اگر تم محبت میں' قابو نہ آسکنے والا سچ جاننا چاہتے ہو تو کھلے دل کے ساتھ خدا کی موجودیت کو مکمل طور پر تسلیم کرو۔ جس قدر تم جنس کو تسلیم کرو گے اسی قدر تم اس سے آزاد ہو جاؤ گے۔ جتنا زیادہ تم جبر کرو گے اتنا ہی زیادہ تم اس کپڑوں میں الجھے ہوئے دہقان کی طرح جنس میں پھنس جاؤ گے۔ جتنی زیادہ تسلیم اختیار کرو گے اتنی ہی زیادہ نجات حاصل کرو گے۔ زندگی میں جو کچھ فطری ہے' جو کچھ خدا کی عطا ہے اس کو کامل طور پر تسلیم کر لینے سے تم الوہیت کی رفیع ترین اقلیم میں پہنچ جاؤ گے! ترفع کی ان دیکھی بلندیوں تک پہنچ جاؤ گے! میں تسلیم کو خدا پرستی گردانتا ہوں۔ اور خدا پر ایسا یقین ہی نجات کا دروازہ ہے۔

میں ان تمام تعلیمات کو لادینیت قرار دیتا ہوں جو انسان کو اس الوہی سکیم اور زندگی میں جو کچھ فطری ہے اسے تسلیم کرنے سے روکتی ہیں۔ "زندگی میں جنس کی مخالفت کرو۔ زندگی میں اس کو دبا کر رکھو۔ فطرت تو گناہ ہے' شر ہے' شہوت ہے' اسے ترک کر دو' اسے چھوڑ دو۔" یہ تمام تعینات میرے نزدیک لادینیت ہے۔ جو لوگ ترک کا پرچار کرتے ہیں وہ سب لادین ہیں۔ زندگی کو اس کی خالص اور فطری شکل میں تسلیم کرو' اس کی کاملیت کے لئے سعی کرو' یہ کاملیت تمہیں درجہ بدرجہ بلندیاں عطا

کرے گی۔ تسلیم انسان کو رفعت بخشتی ہے۔ اگر جنس کوئلہ ہے تو وہ دن ضرور آئے گا جب یہ خود کو ہیرے کے روپ میں پیش کرے گی ------ اور یہی پہلا اصول ہے۔

دوسری بنیادی شے جو میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں وہ ہے جسے انسان کے تمدن' تہذیب اور مذہب نے ہمارے اندر اب تک پختہ کر دیا ہے۔ اور وہ ہے یہ شعور کہ "میں ہوں" ------ انا۔

پہلا اصول جنس کی توانائی کو محبت کی طرف رواں دواں ہونے کے لئے انگیخت کرتا ہے لیکن "انا" اس کو ایک دیوار بن کر مسدود کر دیتی ہے۔ محبت کی روانی رک جاتی ہے۔

انسان برا ہو یا نیک' مقدس ہو یا غیر مقدس' انا سب میں برابر طاقت ور ہوتی ہے۔ برے لوگ انا پرست ہوتے ہیں اور کئی طریقوں سے انا کو ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن نیک لوگ بھی انا کا ڈھول پیٹتے ہیں۔ وہ جنت میں جانا چاہتے ہیں' وہ نجات چاہتے ہیں' وہ دنیا کو مسترد کر دیتے ہیں۔ وہ معبد بناتے ہیں' وہ گناہ نہیں کرتے' وہ جانے کیا کیا کرتے ہیں۔ لیکن انا راہ نما اشارے کی طرح ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔ اور جتنی مضبوط کسی کی انا ہو گی اتنا ہی وہ دوسروں سے روابط قائم کرنے سے معذور ہو گا۔ کیونکہ انا رابطہ کرنے والوں کے درمیان آ کھڑی ہو گی' "میں" اپنے آپ کو جتائے گی۔ یہ ایک دیوار ہے۔ یہ اعلان کرتی ہے کہ "تو" الگ ہے اور "میں" الگ۔ اور انا ہی کی وجہ سے گہرا جنسی تجربہ بھی لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب نہیں لا سکتا' بدن تو نزدیک تر ہوتے ہیں لیکن لوگ حقیقتاً دور ہوتے ہیں۔ جب تک اندر "میں" موجود ہے "تو" کے احساس سے چھٹکارا ناممکن ہے۔ انا فاصلوں کو' اجنبیت کو' دوری کو' دوئی کو جنم دیتی ہے۔ انا قربتوں' یکجائیوں' اپنائیت کی دشمن ہے۔ یہ قربتوں میں بھی جدائی کو' دوری کو' افتراق و اختلاف کو برقرار رکھتی ہے۔ یہ دوسراہٹ کو جنم دیتی ہے۔

سارتر نے کہیں ایک بہت حیرت انگیز جملہ لکھا ہے: "دوسراہٹ جہنم ہے۔" لیکن اس نے مزید وضاحت نہیں کی کہ دوسراہٹ کیوں جہنم ہے یا یہ کہ دوسراہٹ

کیونکر دو سراہٹ ہوتی ہے۔

"دوسرا" (تو) تو "دوسرا" ہی رہے گا کیونکہ "میں" جو "میں" ہوں اور جب تک "میں" باقی ہے اردگرد کی ساری دنیا "دوسرا" ہے"' تو ہے ----- مختلف اور علیحدہ' دور' اور جب تک علیحدگی کا یہ احساس موجود ہے' محبت کو محسوس نہیں کیا جا سکتا۔ محبت ایک تجربہ ہے یکجائی کا۔ محبت کا تجربہ تو دیواروں کا انہدام ہے' دو توانائیوں کا اشتقاق ہے' محبت ایک ایسی مسرت ہے جس میں دوئی کی زنجیریں ٹوٹ گرتی ہیں' جہاں دو جانیں ایک قالب میں سمانے کے لئے اختلاط کرتی ہیں۔ جب دو افراد کے مابین اس طرح کی ہم آہنگی پیدا ہو جائے تو میں اسے محبت قرار دوں گا' اور اگر یہ فرد اور اجتماع کے مابین جنم لے تو میں اسے خدا سے وصال کا نام دوں گا۔ اگر میں یا کچھ دوسرے لوگ ایک ایسے تجربے میں مستغرق ہوں کہ تمام حدیں پگھل جائیں' روحانی سطح پر تب یہ محبت ہو گی۔ اور اگر یہ یکجائی میرے اور ہر شخص کے مابین شعوری طور پر قائم ہو تاکہ میں اجتماع میں اپنی ذات گم کر دوں تو یہ تسلیم اور یہ انضمام دراصل خدا سے ہو گا' خدا جو الاعلیٰ ہے' رفیع و عظیم ہے اور سب کچھ ہے۔ لہٰذا میں کہتا ہوں کہ محبت پہلا قدم ہے اور خدا منزل! نفیس ترین اور دائمی منزل!

اگر یوں ہے تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ میں اپنے آپ سے تغافل برتوں؟ جب تک میں انا کو تحلیل نہیں کروں گا کوئی دوسرا مجھ سے کیوں کر یکجائی اختیار کرے گا' ایک جان دو قالب ہونا کیسے ممکن ہو گا' انضمام کیوں ہو گا اور دوئی کیونکر مٹ سکے گی؟ "تو" میری "میں" کے ردعمل میں تخلیق ہوتا ہے۔ جتنا زیادہ زور سے میں اپنی "میں" کے بارے میں چلاؤں گا' اتنا ہی زیادہ شدت کے ساتھ "تو" وجود میں آئے گا۔ "تو" واقعتاً "میں" کی گونج ہے!

اور یہ "میں" ----- یہ "انا" کیا ہے؟ کیا تم نے کبھی ٹھہر کر اس کے متعلق سوچا ہے؟ تمہارے اعضاء تمہاری ٹانگ' ہاتھ' سر اور دل اور تمہاری انا کیا ہے؟ یہ ہے کیا اور کہاں ہے؟ تم جب اپنی انا کے بارے میں سوچو تو تمہیں ادراک ہو گا کہ یہ کہاں

ہے؟ تمہیں نہیں معلوم۔ اس کا احساس تو ہو سکتا ہے مگر اس کی خاص جائے وقوع معلوم نہیں ہو سکتی ہے۔ ایک پل کو خاموش بیٹھ رہو اور "میں" کو تلاشو۔ تم یہ جان کر حیران ہو جاؤ گے کہ شدید تلاش کے باوجود تم کسی جگہ اپنی "میں" کو نہیں پا سکو گے۔ تم تسلیم کرو گے کہ "میں" کہیں نہیں ہے۔ یہاں کوئی "انا" نہیں ہے۔ تو جہاں "میں" ایک حقیقت ہے وہاں "میں" کہیں نہیں ہے!

جانا مانا درویش ناگ سین ایک بار راجہ ملند کے دربار بلا بھیجا گیا۔ قاصد ناگ سین کے پاس گیا اور بولا: "اے درویش ناگ سین! راجہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں آپ کو دعوت دینے آیا ہوں۔"

ناگ سین: "اگر تمہیں میں مطلوب ہوں تو میں حاضر ہوں لیکن مجھے معاف رکھو کہ یہاں کوئی ناگ سین نہیں ہے۔ یہ محض ایک نام ہے' ایک فانی وجود۔"

قاصد نے واپس جا کر راجہ کو اس مرد عجیب کے متعلق رپورٹ دی کہ اس نے آپ کا حاضری کا بلاوا سن کر جواب دیا کہ وہ حاضر ہو جائے گا لیکن ناگ سین جیسا کوئی شخص وہاں ہے نہیں۔ راجہ اس معمے کو سن کر حیران رہ گیا۔ "میں آ جاؤں گا۔ ناگ سین کوئی ہستی نہیں رکھتا۔" وہ جتنا درویش کے اس جملے کو سوچتا اس کی حیرت بڑھتی۔ خیر مقررہ وقت ناگ سین شاہی رتھ میں پہنچ گیا۔ راجہ نے دروازے پر اس کا استقبال کیا: "درویش ناگ سین! میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔" یہ سن کر درویش ہنسنے لگا: "میں ناگ سین کے طور پر تمہاری میزبانی قبول کرتا ہوں لیکن یہاں کوئی ناگ سین نام کا بندہ ہے نہیں۔"

راجہ نے کہا: "آپ تو پہیلیوں میں بات کر رہے ہیں۔ اگر آپ ناگ سین نہیں ہیں' تو دعوت کون قبول کر رہا ہے؟ کون ہے جس کا میں اس گھڑی استقبال کر رہا ہوں؟"

ناگ سین نے پیچھے دیکھا اور کہا: "کیا جس میں بیٹھ کر میں آیا ہوں یہ رتھ نہیں ہے؟"

"ہاں یہ رتھ ہی ہے۔"

درویش: "مہربانی کر کے گھوڑے کھول دو۔"

ایسا ہی کیا گیا۔ راجہ سخت متجسس تھا۔ درویش اپنے مخصوص مست اور رمزیہ اسلوب میں دو سمجھا رہا تھا جسے میں تمہیں بھی سمجھانا چاہتا ہوں کہ "میں" ہو کے بھی نہیں ہے۔ ہر چند کہیں کہ ہے' نہیں ہے۔

گھوڑے رتھ سے الگ کر دیے گئے تو درویش ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: "کیا یہ

رتھ ہے؟"

راجہ نے کامل اشتیاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا: "گھوڑوں کو رتھ کیوں کر کہا جا سکتا ہے؟ یہ تو واضح ہے کہ یہ گھوڑے ہیں رتھ نہیں۔"

درویش نے اشارہ کیا تو گھوڑے اس کی طرف بڑھ آئے' اور پھر اشارہ کیا تو گھوڑے غائب ہو گئے۔ اب درویش نے کہا: "گھوڑوں کو جن بانسوں کے ساتھ رتھ میں جوتا گیا تھا انھیں کھولا جائے۔"

ایسا ہی کیا گیا تو درویش نے انھیں بھی غائب کر دیا اور کہا: "کیا بانس تمہارا رتھ تھے؟"

راجہ نے سعادت مندی سے کہا: "نہیں اے درویش! بانس کیونکر رتھ کہلوا سکتے ہیں"

تب درویش کے کہنے پر پہیے نکال دیے گئے۔

"کیا یہ پہیے تمہارا رتھ ہیں؟" اس نے دریافت کیا

"قطعی نہیں' یہ پہئے ہیں' رتھ نہیں۔" راجہ نے تیزی سے کہا' اس کی دلچسپی فزوں ہوتی جا رہی تھی۔ یکے بعد دیگرے ان سوالوں سے آخر درویش کیا ثابت کرنا چاہتا ہے۔ وہ بہت توجہ سے یہ سب کھیل دیکھ رہا تھا اور اس کا حصہ بنا ہوا تھا۔

درویش نے ایک ایک کر کے تمام حصے غائب کر دیے اور ہر بار راجہ نے وہی جواب دیا کہ "یہ رتھ نہیں ہے۔" بالآخر کچھ بھی نہیں بچا۔ درویش نے پوچھا: "تمہارا رتھ کہاں ہے؟ ہر حصے کو تم نے قرار دیا کہ یہ رتھ نہیں ہے --- مجھے بتاؤ' پھر رتھ کہاں ہے؟

اس پر تو راجہ چکرا کے رہ گیا۔ درویش کہتا رہا: "کیا تم کچھ سمجھے؟ رتھ محض ایک مجموعہ تھا۔ یہ کچھ مخصوص اشیا سے مل کر بنا تھا۔ رتھ کا اپنا کوئی وجود نہیں ہے۔ مہربانی کر کے اپنی "میں" کو تلاشو۔ تم جان پاؤ گے کہ "میں" کہیں نہیں ہے۔ یہ بہت سی توانائیوں کا مرکب ہے اور بس۔ تم اپنے اعضا کے متعلق غور کرو۔ اپنے آپ کے ہر پہلو کے متعلق سوچو۔ ایک کے بعد ایک ہر چیز ختم ہو جائے گی اور آخر الامر معدومیت بچے گی۔ محبت اسی معدومیت کی زائیدہ ہے۔ کیونکہ معدومیت تم نہیں ہو' معدومیت تو خدا ہے۔ ع نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا۔ تم "میں" کی کثافت سے آلودہ ہو کر خدا سے خالی ہو گئے ہو۔ لطافت کو نہاں کر دیا گیا ہے۔ دنیا اناؤں کا بے ہنگم ہجوم بن کے رہ گئی ہے' جہاں ہر کوئی اکیلا ہے۔ ایک دوسرے سے الگ تھلگ' محض اغراض کے رشتوں سے بندھا ہوا۔ بھیڑ تنہائیوں کا میلا ہے۔ آدمی آدمی اکیلا ہے۔ لو ایک حکایت سنو۔ کسی بستی میں ایک شخص نے

مچھلیوں کی ایک بڑی دکان کھولی' جس پر اس نے بڑا سا سائن بورڈ لگوایا' جس پر لکھا تھا: "یہاں تازہ مچھلیاں فروخت ہوتی ہیں۔" پہلے ہی دن ایک آدمی دکان پر آیا اور اس نے پڑھا: "یہاں تازہ مچھلیاں فروخت ہوتی ہیں۔" ---- تازہ مچھلیاں؟ کیا کہیں باسی مچھلیاں بھی فروخت ہوتی ہیں؟ تازہ مچھلیاں' لکھوانے میں کیا حکمت ہے؟"

دکان دار نے اس کی بات درست مان لی اور لفظ "تازہ" کو مٹوا دیا۔ اب سائن بورڈ پر لکھا جملہ یوں پڑھا جاتا تھا: "یہاں مچھلیاں فروخت ہوتی ہیں۔"

ایک بوڑھی خاتون اگلے روز دکان پر آئی۔ اس نے اونچی آواز میں کہا: "یہاں فروخت ہوتی ہیں کیا تم کسی اور جگہ بھی مچھلیاں فروخت کرتے ہو؟"

دکان دار نے کہا: "نہیں۔"

چنانچہ اس خاتون کے مشورے سے "یہاں" کا لفظ بھی مٹا دیا گیا۔ اب بورڈ یوں پڑھا جاتا تھا: "مچھلیاں فروخت ہوتی ہیں۔" تیسرے دن ایک اور گاہک دکان پر آیا اور بولا: "مچھلیاں فروخت ہوتی ہیں؟ کیا کوئی شخص مچھلیاں مفت بھی دیتا ہے؟"

چنانچہ اب "فروخت ہوتی ہیں" بھی مٹا دیا گیا۔ صرف لفظ "مچھلیاں" باقی رہ گیا۔ ایک معمر شخص آیا اور اس نے دکان دار سے کہا: "مچھلیاں؟ ایک اندھا بھی دور سے محض بو سونگھ کر بتا سکتا ہے کہ یہ مچھلیوں کی دکان ہے۔"

اس کی بات مان کر دکان دار نے لفظ "مچھلیاں" بھی سائن بورڈ سے مٹا دیا۔ اس کے بعد بورڈ بالکل صاف ہو گیا۔ ایک راہ گیر نے اعتراض کیا: "یہ سادہ بورڈ کیوں لگا رکھا ہے؟" اس پر سادہ بورڈ بھی اتار دیا گیا۔ اور اس "تزکیہ" کے عمل کے بعد کچھ بھی باقی نہیں بچا۔ ایک ایک چیز الگ کر دی جائے تو جو کچھ باقی بچتی ہے وہ معدومیت ہی بچتی ہے' ایک خلا ہی بچتا ہے۔

محبت اسی خالی پن سے جنم لے سکتی ہے۔ ایک خلا ہی میں دوسری خلا کا انضمام ہو سکتا ہے۔ ایک صفر کے ساتھ دوسرا صفر جڑ سکتا ہے۔ دو فرد نہیں بلکہ دو خلا ایک دوسرے مل سکتے ہیں کیونکہ اب ان کے بیچ کوئی حد فاصل نہیں ہوتی۔

ہر چیز کی دیواریں ہوتی ہیں لیکن خلا کی دیواریں نہیں ہوتیں۔ یہی دوسری یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ محبت صرف اس وقت جنم لیتی ہے جب انفرادیت ختم ہو جاتی ہے' جب من و تو کا پردہ حائل نہیں رہتا۔ جب ذا محدودیت ہو تو سب کچھ ہوتا ہے سوائے "میں" کے۔

تسلیم اختیار کرتے ہی حدیں ٹوٹ جاتی ہیں اور ہر دم تیار "گنگا" کا ظہور ہوتا ہے۔ لامحدودیت میں رسائی چاہتے ہو تو انفرادیت کی دیواروں کو گرانا ہوگا۔ اجنبیت اور فاصلوں کو جنم دینے والی ہر شے کو خود سے دور کرنا ہو گا --- اور سب سے اولین استرداد "میں" کا کرنا ہوا گا۔ "میں" سے نجات پانے کے بعد جو خالی پن' جو معدومیت وجود پائے گی اس سے محبت ---- تخلیق کی توانائی ظہور کرے گی۔ انتشار' بے سکونی' اضطراب' عدم تکمیلیت ---- یہ سب "میں" کے جھلملاتے سائے ہیں جنھوں نے تمہاری جنس کی تابندگی کو دھندلا دیا ہے۔ "میں" ---- انا سے نجات میں نروان ہے' جنت ہے' سکون ہے' بے اندیشگی ہے اور تکمیل ہے۔ سو معدومیت کو وجود میں لانے کی سعی کرو۔

ہم ایک کنواں کھودتے ہیں۔ پانی زمین کے اندر ہی ہوتا ہے کسی دوسری جگہ سے نہیں لایا جاتا۔ ہم صرف زمین کو' پتھروں کو کھودتے اور پرے ہٹاتے ہیں۔ ہم وہاں کیا کرتے ہیں؟ غور سے سنو ہم وہاں کیا کرتے ہیں؟ ہم وہاں ایک "خالی پن" تخلیق کرتے ہیں۔

ایک کنواں کھودنے کا مطلب ہے ایک خالی پن تخلیق کرنا تاکہ جو پانی اندر نہاں ہے' نہیں نمود کے لئے خالی جگہ پائے اور خود کو عیاں کرے۔ جو کچھ اندر ہے وہ جگہ چاہتا ہے' خلا چاہتا ہے' ایک خالی پن کی آرزو کرتا ہے جو اس کو پھوٹ بہنے' باہر آنے' نمود کرنے اور عیاں ہونے کے لئے حاصل نہیں ہے۔ کنواں ریت اور پتھروں سے بھرا ہوتا ہے۔ جس وقت ہم ریت اور پتھر ہٹاتے ہیں' پانی بتدریج اوپر اٹھتا ہے۔ بالکل اسی طرح انسان محبت سے بھرا ہوا ہے مگر اس کے صدور کے لئے خلا چاہیے۔ جب تک تمہاری روح اور تمہارا دل' تمہاری "میں" کو مان رہے ہیں اس وقت تک تم ریت اور پتھر سے معمور کنواں رہو گے اور تب تک محبت کی دھارا تمہارے کنویں سے ظہور نہیں کرے گی۔

انا ..... یعنی "میں" اور محبت ..... جنس کی توانائی میں ابدی غیریت اور دوئی کا تعلق ہے۔ جہاں محبت کے گلاب کھلتے ہیں وہ سرزمین انا کی نہیں ہوتی۔ انا تو وحشت اور ویرانے تخلیق کرتی ہے۔ ہزاروں برس کی دشت نوردی کے بعد بھی انا دار انسان اس سے نجات کے لئے آمادہ نہیں۔ انسان کو مذہب' تہذیب اور ماؤں' واعظوں' نام نہاد راہنمائی عطا کرنے والوں نے انا کی زنجیر میں جکڑ دیا ہے اور وہ کہتے ہیں یہ قید آزادی ہے' یہ محرومی نہیں سعادت ہے۔ المیہ تو یہی ہے کہ انا آزادی نہیں جبر کو جنم دیتی ہے۔ انا کو عشق کی توفیق ارزاں نہیں ہوتی۔ "کوئی" سمجھے تو ایک بات کہوں' عشق توفیق ہے گناہ نہیں ---- مگر افسوس

"کوئی" سمجھتا ہو نہیں۔

------- میں نے سنا ہے کہ کہیں پر ایک قدیم پرشکوہ درخت تھا۔ جس کی شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جب اس میں پھول کھلے ہوتے تو ہر شکل' رنگ اور جسامت کی تتلیاں اس کے اردگرد رقص کرتی تھیں۔ جب اس میں شگوفے پھوٹتے اور پھل لگتے تو دور دراز کی سرزمینوں سے پرندے آتے اور چہکتے گاتے تھے۔ شاخیں پھیلی ہوئی مہربان بانہوں کی طرح ہر آنے والے پر اپنا سکون بخش سایہ ارزانی کرتیں۔ پرشکوہ درخت سب کو اپنی آغوش میں بھر لیتا۔

ایک ننھا بچہ بھی اس درخت کے سکوں بخش سائے تلے کھیلنے آیا کرتا تھا۔ بڑے درخت کو اس چھوٹے بچے کے ساتھ انس ہو گیا۔ اگر بڑے کو اپنی بڑائی کا احساس نہ ہو تو بڑے اور چھوٹے کے درمیان محبت ممکن ہے۔ درخت کو بھی علم یا احساس نہیں تھا کہ وہ کتنا بڑا ہے۔ صرف انسان ہی وہ مخلوق ہے جس کو اس طرح کا علم ہوتا ہے۔ کسی بڑے کا سب سے قریبی رشتہ ہمیشہ انا کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن محبت کے لئے کوئی بڑا چھوٹا نہیں ہے' یہ ہر نزدیک آنے والے کو گلے لگا لیتی ہے۔ پس درخت کو اس چھوٹے بچے سے محبت ہو گئی۔ بچہ روز اس کے پاس آتا اور کھیلا کرتا تھا۔ درخت اپنی بلند شاخوں کو اس بچے کے لئے جھکاتا تاکہ وہ ان سے پھل اور پھول توڑ سکے۔ محبت ہمیشہ جھکنے پر آمادہ رہتی ہے' انا جھکنے پر کبھی تیار نہیں ہوتی۔ اگر تم انا کے قریب جاؤ گے تو بجائے جھکنے یا گلے لگانے کے ہاتھ مزید اوپر ہو جائیں گے' یہ اکڑ جائے گی تاکہ تم اس تک رسائی حاصل نہ کر سکو۔ اسی لئے ایسا ہے کہ جس تک رسائی ہو سکتی ہے وہ آدمی چھوٹا ہوتا ہے۔ جو آدمی دور ہے' ناقابل رسائی ہے' وہ آدمی بڑا ہے۔

------- وہ کھلنڈرا بچہ آتا' درخت اپنی شاخیں جھکا دیتا۔ درخت اس سے بہت خوش ہوتا جب بچہ کچھ پھول چن لیتا۔ اس کا سارا وجود محبت کی مسرت سے معمور ہو جاتا۔ محبت ہمیشہ مسرور ہوتی ہے جب وہ کچھ دے پاتی ہے' انا ہمیشہ مسرور ہوتی ہے جب وہ کچھ پاتی ہے۔

------- بچہ بڑا ہو گیا۔ وہ کبھی درخت کی آغوش میں سو جاتا کبھی وہ پھل کھاتا یا کبھی درخت کے پھولوں کا تاج بنا کر پہن لیتا اور جنگل کا بادشاہ بن کر دکھاتا۔ محبت کے پھول جہاں ہوتے ہیں وہاں کوئی شخص بھی بادشاہ جیسا بن سکتا ہے اور جہاں انا کے کانٹے ہوتے ہیں

وہاں ہر شخص گدا اور مصیبت زدہ ہی ہو سکتا ہے۔ محبت بادشاہ گر ہے اور انا فقیر ساز۔

.... لڑکے کو ناچ پہنے اور رقص کرتے دیکھ کر درخت جوش اور مسرت سے معمور ہو جاتا۔ وہ محبت میں جھومتا' صبا کے ساتھ گاتا۔

.... لڑکا اور بڑا ہو گیا۔ اب وہ شاخوں سے جھولنے کے لئے درخت پر چڑھنے لگا۔ جب لڑکا شاخوں سے جھولتا تو درخت بے انتہا خوشی محسوس کرتا۔ محبت کسی ایک کو راحت دیتی ہے تو مسرور ہوتی ہے' انا ہر کسی کو اذیت دے کر مسرور ہوتی ہے۔

.... گزرتے وقت کے ساتھ لڑکے پر ذمہ داریوں کا بوجھ پڑتا گیا۔ آرزوئیں بھی بیدار ہو گئیں۔ اب اسے امتحانوں سے گزرنا تھا' دوستوں کے ساتھ گپیں ہانکنا اور سیریں کرنا تھیں۔ پس وہ درخت کی طرف زیادہ نہ آیا کرتا۔ ادھر درخت اضطراب کے ساتھ اس کا ساتھ اس کا منتظر رہتا۔ اس کی روح بے قراری کے عالم میں پکارتی: "اے میرے دوست! آ جاؤ .... آ جاؤ' میں تمہارا منتظر ہوں۔" محبت شب و روز انتظار کرتی ہے .... اور انتظار تو اس کے اندر ہوا کرتا ہے۔ جب لڑکا نہیں آیا تو درخت اداس ہو گیا۔ محبت اداس ہو جاتی ہے جب کچھ دے نہیں پاتی۔ محبت شرکت میں' سپردگی میں ممنون ہوتی ہے' یہ اس کی سب سے بڑی مسرت ہے۔

بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ لڑکے کا درخت کی طرف کم سے کم آنا معمول بنتا گیا۔ انسان بڑا ہوتا ہے تو اس کی آرزوئیں بڑھتی ہیں۔ وہ محبت کے لئے بہت کم وقت پاتا ہے۔ اب لڑکا دنیاوی معاملات میں الجھ گیا تھا۔ ایک دن وہ قریب سے گزر رہا تھا تو درخت نے اسے پکارا: "سنو! میں تمہارا انتظار کرتا ہوں مگر تم آتے نہیں۔ میں روزانہ تمہاری توقع کرتا ہوں۔"

لڑکا: "تمہارے پاس ہے ہی کیا؟ میں کیوں تمہارے پاس آؤں؟ کیا تمہارے پاس دولت ہے؟ مجھے تو دولت کی تلاش ہے۔"

انا ہمیشہ غرض مند ہوتی ہے۔ اگر کوئی غرض ہو تو انا آئے گی۔ لیکن محبت غرض کی تابع نہیں ہوتی۔ محبت اپنا صلہ آپ ہے۔

لڑکے کا ایسا جواب سن کر درخت حواس باختہ ہو گیا۔ وہ حیرت سے بولا: "تم تبھی آؤ گے جب میں کچھ دوں گا؟ جو پیچھے دینے سے رکے وہ محبت نہیں کرتا۔ انا دولت جوڑتی ہے لیکن محبت غیر مشروط طور پر دے دیتی ہے۔ ہم میں یہ بیماری نہیں ہے اور اس کے نہ ہونے

سے ہم بہت خوش ہیں۔ ہم پر پھول کھلتے ہیں' پھل لگتے ہیں۔ ہم سکون بخش چھاؤں بکھیرتے ہیں۔ ہم صبا کے ساتھ رقص کرتے ہیں اور پرندوں کے ساتھ گیت گاتے ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے پاس دولت جیسی کوئی شے نہیں ہوتی۔ جس دن ہم دولت کی ہوس میں مبتلا ہو گئے تو ہمیں بھی کمزور اور احمق انسانوں کی طرح معبدوں کو جانا پڑے گا اور محبت اور سکون کو تلاش کرتے پھرنا ہو گا۔ نہیں ہم دولت نہیں رکھتے۔" لڑکا درخت کی یہ شاعرانہ باتیں سن کر بیزاری سے بولا: "اگر ایسا ہے تو میں تمہاری طرف کیوں آؤں؟ میں تو وہاں جاؤں گا جہاں دولت ہے۔ مجھے تو بس دولت کی ضرورت ہے۔"

انا دولت مانگتی ہے کیونکہ وہ طاقت کی طلب گار ہوتی ہے۔ وہ پھولوں' تتلیوں' گیتوں اور صبا کے ساتھ رقص اور بے سروسامانی کی قائل نہیں ہوتی۔

درخت کو محبت نے مجبور کر رکھا تھا۔ اپنے محبوب کی دو ٹوک بات سن کر اس نے ایک پل کو سوچا اور کہا: "اچھا میرے عزیز! تم کچھ نہ کرو ــــــ میرے پھل توڑو اور انہیں بیچو۔ تمہیں دولت مل جائے گی۔"

یہ سن کر لڑکا بہت پرجوش ہوا۔ وہ بہت خوش تھا کہ درخت کا اتنا بہت سارا پھل تو اسے مالا مال کر دے گا۔ وہ فوراً درخت پر چڑھ گیا۔ کہاں تو وہ وہاں ٹھہرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اس نے سارے پھل توڑ لئے۔ یہاں تک کہ کچے پھلوں کو بھی نہ رہنے دیا۔ درخت بہت مسرور تھا۔ حالانکہ کچھ چھوٹی اور بڑی ٹہنیاں ٹوٹ گئیں' بہت سے پتے ٹوٹ کر گرے۔ محبت ٹوٹ جانے پر بھی خوش ہوتی ہے۔ انا حاصل کر کے بھی ناخوش رہتی ہے' وہ مزید کی تمنائی ہوتی ہے۔ درخت نے خوشی کے عالم میں یہ سوچا بھی نہیں کہ اس کا دوست پھل تو سارے توڑ کر لے گیا لیکن شکریہ کا ایک حرف تک نہیں کہہ گیا بلکہ اس نے تو پیچھے مڑ کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ محبت دے کر ہی شکریہ پا لیتی ہے۔ اسے لفظوں میں شکریہ ادا کروانا مطلوب نہیں ہوتا۔

اس بات کو بھی دن گزر گئے۔ لڑکا نہ آیا۔ کیونکہ اس کے پاس پھلوں کی فروخت کے بعد کافی دولت آ گئی تھی۔ وہ اس دولت سے مزید دولت کمانے میں مصروف تھا۔ وہ درخت کے بارے میں سب کچھ بھلا بیٹھا تھا۔ برس گزر گئے۔ درخت اداس ہو گیا۔ وہ لڑکے کی آمد کی آرزو میں مرا جا رہا تھا۔ اس کی حالت اس ماں کے جیسی ہو گئی تھی جس کی چھاتیاں دودھ سے بھری ہوں اور اس کا بیٹا گم ہو گیا ہو' اس کا سارا وجود لڑکے کا تمنائی ہو۔ وہ لڑکے کو

پاگلوں کی طرح تلاش کر رہی ہو کہ وہ آئے اور اس میں زندگی کی حرارت بھر دے۔ ایسی ہی اس درخت کے اندر کی پکار تھی۔ اس کا سارا وجود ایک چیخ بن چکا تھا۔

کئی برس بعد' جب یہ لڑکا جوان مرد بن چکا تھا' درخت کی طرف آیا۔ درخت بے تابی سے بولا: "آؤ --- میرے بچے! مجھے گلے لگا لو۔"

لڑکے نے کہا: "جذباتیت چھوڑو۔ یہ عہد طفلی کی باتیں ہیں۔ میں اب بچہ نہیں۔"

انا محبت کو جذباتیت اور پاگل پن سمجھتی ہے' ایک بچگانہ خیال۔ لڑکے کی اس درشتی اور سرد مہری کے باوجود درخت نے دعوت دی: "آؤ' میری شاخوں سے جھولو' رقص کرو' میرے ساتھ کھیلو۔" لڑکا جو اب جوان مرد' بالغ آدمی تھا' اسی بے رخی اور غیر جذباتی پن سے بولا: "بے معنی باتیں مت کرو۔ میں گھر بنانا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھے گھر دے سکتے ہو؟"

درخت حیران ہوا ..... اس نے کہا: "گھر؟ ..... میں تو گھر کے بغیر ہوں۔ گھروں میں تو انسان رہتا ہے۔ انسان کے علاوہ کوئی بھی مخلوق گھروں میں نہیں رہتی۔ اور کیا تم نے چار دیواروں میں محصوری کی وجہ سے اس کی حالت نہیں دیکھی؟ جتنی بڑی عمارت بنائی جائے گی آدمی اتنا ہی چھوٹا ہو جائے گا۔ ہم گھروں میں نہیں رہتے ..... بہرحال تم میری شاخیں کاٹ کے لے جا سکتے ہو' پھر تم یقیناً ان کی مدد سے گھر بنا پاؤ گے۔"

پہلے کی طرح آدمی کی دلی مراد بر آئی۔ وہ وقت ضائع کئے بغیر ایک کلہاڑا لایا اور اس نے درخت کی تمام شاخیں کاٹ لیں۔ درخت اب ایک عریاں تنا رہ گیا تھا۔ مگر محبت ایسی باتوں کی پروا بھی نہیں کرتی خواہ اس کے اعضا اس کے محبوب کی خاطر کاٹ لئے جائیں۔ محبت دینے کے لئے ہمیشہ آمادہ رہتی ہے۔

پہلے ہی کی طرح آدمی درخت کا شکریہ ادا کئے بغیر چلا گیا۔ درخت نے معمول کی طرح اس کو روا کیا' وہ اپنے محبوب دوست کی آرزو پوری کر کے ہی خوش تھا۔

آدمی نے اپنا گھر تعمیر کر لیا۔ دن برسوں میں بدلنے لگے۔ تنا انتظار ہی کرتا رہا۔ وہ انتظار کی اذیت اور دوست کے دیدار سے محرومی کے کرب کی وجہ سے چیخنا چاہتا تھا مگر وہ بات تک نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کی شاخیں اور پتے ہو نہیں تھے۔ ہوا چلتی مگر وہ اسے کوئی پیغام نہ دے سکتا۔ وہ بول نہیں سکتا تھا مگر اس کی روح میں یہی دعا گونجتی رہتی: "آجاؤ' آجاؤ' میرے محبوب' آجاؤ۔" لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ وقت گزرا اور لڑکا اب بوڑھا ہو گیا ایک بار وہ وہاں سے گزرا اور درخت کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔

درخت بولا: "میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟ تم ایک طویل عرصے کے بعد آئے ہو۔"

آدمی کا رویہ پہلا سا ہی تھا' بولا: "تم کیا کر سکتے ہو؟ میں دور دیس دولت کمانے کے لئے جانا چاہتا ہوں۔ مجھے سفر کے لئے کشتی کی ضرورت ہے۔"

درخت خوشی سے بولا: "میرے محبوب! کوئی مسئلہ نہیں۔ تم میرا تنا کاٹ لو اور اس سے کشتی بنا لو۔ میں دور دیس دولت کمانے کے لئے جانے میں تمہارے ساتھ تعاون کر کے خوشی محسوس کروں گا ..... مگر مہربانی ہو گی' یاد رکھنا' میں تمہاری جلد واپسی کا منتظر رہوں گا۔"

دولت کے لئے اپنا دیس چھوڑ جانے پر آمادہ' وہ غرض سے بھرا ہوا شخص ایک آرا لایا۔ درخت کاٹا' کشتی بنائی اور چل دیا۔

اب درخت ایک چھوٹا سا ٹھنٹھ رہ گیا تھا۔ ٹھنٹھ جو کبھی ایک بہت بڑا پرشکوہ درخت تھا' اپنے محبوب کی واپسی کا انتظار کرتا تھا۔ وہ انتظار ہی کرتا رہا۔ آدمی واپس نہیں آیا' کیونکہ انا وہیں جاتی ہے جہاں پانے کے لئے کچھ ہوتا ہے۔ درخت کے پاس دینے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ انا وہاں نہیں جاتی جہاں پانے کے لئے کچھ نہ ہوتا۔ انا' ایک ابدی فقیر' ایک مستقل طلب کی حامل ہوتی ہے۔ اور محبت خیرات ہے۔ یہ ایک بادشاہ ہے' ایک شہنشاہ ہے۔ کیا کہیں محبت سے بڑا بادشاہ بھی ہے؟ ایک شب میں اس ٹھنٹھ کے قریب ہی آرام کر رہا تھا کہ وہ بولا: "میرا دوست نہیں آیا۔ میں بہت پریشان ہوں' کہیں وہ ڈوب ہی نہ گیا ہو۔ شاید وہ کھو چکا ہے۔ اس نے خود کو دور دیس میں گنوا ہی نہ دیا ہو۔ وہ اب بچا نہیں ہو گا۔ میں اس کے بارے میں خیر کی خواہش کیسے کروں! میں خود زندگی کے اختتام کے قریب ہوں۔ میں کم از کم اس کی خیریت کی خبر سن لوں تو مطمئن ہو جاؤں گا۔ اس صورت میں مسکراتے چہرے کے ساتھ مر سکوں گا۔ میں اسے بلاؤں بھی تو وہ میرے پاس نہیں آئے گا کیونکہ میرے پاس دینے کو کچھ نہیں رہا' اور وہ صرف لینے کی زبان ہی سمجھتا ہے۔ انا صرف "لینے کی زبان" سمجھتی ہے۔ محبت "ایثار کی زبان" ہے۔ میں اس کے علاوہ مزید کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آہ! اس کے علاوہ کہنے کو مزید کچھ ہے بھی تو نہیں۔

اگر زندگی اس درخت کی طرح ہو سکتی' جس کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں تاکہ ہر شخص اس کے سائے تلے سکون حاصل کرے تو ہم جان سکتے ہیں کہ محبت کیا ہے؟ محبت کا نہ کوئی صحیفہ ہے' نہ چارٹ اور نہ ہی کوئی لغت۔ نہ ہی اس کے لئے اصولوں کا کوئی

حیثیت ہے۔

میں فکر مند تھا کہ میں محبت کی بابت کیا کہہ سکتا ہوں! اسے بیان کرنا سہل نہیں۔ محبت میری آنکھوں میں ممکنہ طور پر دیکھی جا سکتی ہے' اگر تم اتنا قریب آؤ کہ میری آنکھوں کے آر پار دیکھ سکو۔ مجھے حیرت ہو گی اگر میرے چلتے ہوئے بازوؤں میں کوئی نہ سمائے۔

محبت؟..... اگر یہ میری آنکھوں میں محسوس نہیں ہوتی' میرے بازوؤں میں' میری خاموشی میں..... تو پھر یہ میرے لفظوں سے تو بالکل محسوس نہیں کی جا سکتی۔

دوسرا باب

جبر سے آزادی کی طرف

جانِ عزیز!

ایک صبح ایک مچھیرا سورج طلوع ہونے سے بھی پہلے دریا کو گیا۔ دریا کے کنارے پر پہنچ کر اسے اپنے پیروں تلے کچھ محسوس ہوا۔ اسے ایسا لگا جیسے کوئی چھوٹی سی پتھروں بھری بوری اس کے پاؤں کے نیچے ہے۔ اس نے بوری کو اٹھایا اور بے دیکھے بھالے ایک طرف کو رکھ دیا۔ اس کا جال سورج طلوع ہونے کے انتظار میں دریا کنارے پڑا تھا۔ وہ اپنے کام کے آغاز کے لئے دن کی روشنی نمودار ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس پر سستی سی طاری ہونے لگی۔ اسی کیفیت میں اس نے تھیلے میں سے ایک پتھر نکالا اور پانی میں پھینک دیا۔ "غڑاپ" کی آواز آئی جسے سن کر وہ محظوظ ہوا اور اس لطف کو بڑھانے کے لئے ایک اور پتھر پانی میں پھینک دیا۔ کرنے کے لئے کوئی اور کام تھا نہیں سو وہ ان پتھروں ہی کو ایک ایک کر کے پانی میں پھینکتا اور لطف اندوز ہوتا رہا۔ دھیرے دھیرے سورج طلوع ہوا۔ ہر طرف اجالا ہو گیا۔ اس وقت تک وہ ایک کے سوا تمام پتھر پھینک چکا تھا۔ یہ آخری پتھر اس کے ہاتھ میں تھا جب اس کی نظر اپنے ہاتھ میں دبے پتھر پر پڑی اس کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ وہ تو ایک ہیرا تھا! اندھیرے کی وجہ سے اس نے ایسے ہی سارے ہیرے دریا میں پھینک دیئے تھے۔ یہ سب اس نے نادانستگی میں گنوا دیا تھا! سخت پچھتاوے کے عالم میں وہ خود کو ملامت کرتا ہوا سسکتا اور چلاتا رہا اور شدت غم سے نیم پاگل ہو گیا۔ اتفاقیہ طور پر بہت بڑی دولت اس کے ہاتھ لگ گئی تھی جو اس کی زندگی کی کایا پلٹ دیتی لیکن اندھیرے اور لاعلمی کی وجہ سے وہ اسے گنوا

بیٹھا۔ تاہم ایک اعتبار سے وہ خوش قسمت بھی تھا کہ ابھی ایک ہیرا اس کے ہاتھ میں رہ گیا تھا اور اسے پھینکنے سے قبل ہی روشنی ہو گئی تھی۔ عمومی طور پر سب اس طرح خوش نصیب نہیں ہیں۔ ہر طرف اندھیرا ہے' وقت زوال پا رہا ہے' سورج طلوع نہیں ہوتا اور ہم پہلے ہی زندگی کے سارے بیش قیمت ہیرے گنوا چکے ہیں۔ زندگی ہیروں کا ایک عظیم دفینہ ہے اور انسان سوائے ہیروں کو پھینکنے کے اور کچھ نہیں کر رہا۔ جب تک زندگی کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا جاتا ہم اسے یونہی بتا دیں گے۔ تمام رمزے سب اسرار' ساری سعادت و مسرت' کل نجات' سب جنتیں ہم کھو چکے ہیں۔ زندگی برباد ہو گئی ہے۔ آئندہ صفحات میں میں زندگی کے خزانے کے بارے میں بات کرنے چلا ہوں۔ ان کو روشنی میں لانا سخت دشوار امر ہے جو زندگی کے ساتھ پتھروں کے تھیلے کا سا برتاؤ کرتے ہیں۔ جب جب تم بتاؤ گے کہ لوگ جنہیں پتھر سمجھ کر پھینک رہے ہیں درحقیقت ہیرے ہیں تو وہ تم سے خفا ہو جائیں گے۔ وہ آگ بگولہ ہو جائیں گے۔ اس لئے نہیں کہ تم نے جو کچھ بتایا ہے وہ غلط ہے بلکہ اس لئے کہ تم نے ان کی حماقت کو بے نقاب کر دیا ہے۔ اس سے انہیں اپنے نقصانات یاد آئیں گے۔ انا عود کر آئے گی۔ باوجود اس کے کہ وہ اب تک گنواتے ہی آئے ہیں زندگی بس تھوڑی سی ہی رہ گئی ہے' گویا صرف "ایک پتھر" ہی باقی ہے' تاہم اسے بچایا جا سکتا ہے۔ سیکھنے میں کبھی دیر نہیں ہوا کرتی۔ اب بھی کچھ نہ کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اور خصوصاً" زندگی میں سچ کو جاننے کے لئے تو کبھی بھی دیر نہیں ہوئی ہوتی۔ اس کے جاننے میں جھجک محسوس کرنے کی تو کوئی وجہ ہی نہیں ہے۔

لیکن لاعلمی اور اندھیرے کی وجہ سے ہم نے زندگی کے تھیلے کو پتھروں کے ڈھیر سے زیادہ اہمیت دی ہی نہیں ہے۔ سچ کو تلاش کرنے کی کوشش سے پہلے ہی شکست تسلیم کر لی گئی ہے۔ میں آغاز ہی میں تقدیر پرستی کی ہلاکت خیزی کے خلاف متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس مغالطے' اس یقین میں ڈھل جانے والی شکست کے متعلق خبردار کرنا چاہتا ہوں۔ زندگی ریت اور پتھروں کا ڈھیر نہیں ہے۔ اگر تم درست ذہن سے دیکھنا

چاہو تو زندگی میں بہت کچھ اچھا ہے۔ تم خدا کو پہنچنے والا زینہ زندگی ہی میں پا سکتے ہو۔ ہمارے جسم میں' جو خون' گوشت اور ہڈیوں سے مل کر بنا ہے' کچھ ہے' جو ان سب چیزوں سے جدا ہے۔ اسے خون' گوشت اور ہڈیوں سے کوئی غرض نہیں۔ یہ اس محض مادی جسم میں ہے' جیسے آج پیدا ہو کر کل فنا ہو جاتا ہے۔ یہ لافانی ہے۔ اس کا نہ کوئی آغاز ہے اور نہ کوئی اختتام۔ یہ کہ جس کا کوئی روپ نہیں' موت کے اندر بھی ہے۔ لاعلمی کے اندھیرے کو اس لافانی شعلے کی تمنا سے اجالو۔ یہ لافانی شعلہ فانی دھوئیں کے بہروپ میں ہے۔ ہم اس کی روشنی کو نہیں دیکھ پاتے۔ ہم تو دھوئیں ہی کو دیکھ پاتے ہیں اور لوٹ جاتے ہیں۔ کچھ جرات مند لوگ محض دھوئیں ہی میں جستجو کرتے ہیں اور شعلے تک' جو روحانی جلا کا سرچشمہ ہے نہیں پہنچ پاتے۔

دھوئیں کے پیچھے اس شعلے کی طرف سفر کو کس طرح مکمل کیا جا سکتا ہے؟ وہ سفر جو جسم میں موجود ذات کی طرف ہے۔ ہم کس طرح ورائے ذات کا' اس آفاقی ہستی کا ادراک کر سکتے ہیں جو فطرت کے پردے میں نہاں ہے؟ میں اس کے بارے میں تین مرحلوں میں بات کروں گا۔

سب سے پہلے تو یہ جان لو ہم کچھ تعصبات' تھوپے گئے نظریات اور چغلی فلسفوں میں خود کو ملفوف کر چکے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہم نے خود کو عریاں سچ کے دیدار سے محروم کر لیا ہے۔ ہم زندگی کے متعلق' بنا کسی آگاہی کے' بغیر کسی سعی و کاوش کے اور بغیر کسی تجسس کے ایک مفروضہ پہلے ہی قائم کر چکے ہیں۔ ہمیں ہزاروں برس سے تعلیم دی جاتی آ رہی ہے کہ زندگی لایعنی ہے' بے مصرف ہے' مصیبت ہے۔ ہم اس یقین کے ساتھ ہپناٹائز ہو چکے ہیں کہ ہمارا وجود بے مصرف' بے مقصد اور ہنگامہ و شور سے معمور ہے۔ زندگی کی تحقیر کرنی چاہیے - اس سے کترا کے گزر جانا چاہیے۔ صحیفوں نے اس استقلال کو مزید مضبوط کر دیا ہے لہٰذا اب ہم محسوس کرتے ہیں زندگی

ایک بڑا بابل ہے' محض مصیبتوں اور آرام کی ایک کان۔

محض اس ناقدری کی وجہ سے انسان تمام دلکشی' تمام مسرتوں اور محبت سے محروم ہو گیا ہے۔ انسان ایک بے صورت ڈلا بن چکا ہے۔ انسان دکھوں کا ایک متلاطم سمندر بن چکا ہے۔ اور اگر ایسا ہو رہے تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے کیونکہ انہی غلط تصورات کی وجہ سے انسان نے خود اپنے متعلق غوروفکر کرنا ترک کر دیا ہے۔ آخر کیوں ہمیں ایک ڈلے میں خوب صورتی تلاش کرنی چاہیے؟ اور جب ہمارا پختہ یقین ہے کہ زندگی محض ایک تنہائی کے سوا کچھ نہیں تو آگہی' تزکیہ اور خوب صورتی کا شعور کہاں؟ ہم سوچتے ہیں' کوشش بے معنی ہے۔

زندگی کی طرف ہمارا رجحان اس آدمی کے مماثل ہے جو کسی ریلوے سٹیشن پر ریسٹ روم استعمال کرتا ہے یا اس سیزن ٹکٹ والے مسافر کی طرح ہے جو ویٹنگ روم استعمال کرتا ہے۔ وہ آدمی جانتا ہے کہ وہ وہاں محض لمحاتی طور پر ٹھہرا ہے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ یہاں سے رخصت ہو جائے گا۔ لہٰذا اس ویٹنگ روم کی کیا اہمیت! کچھ بھی تو نہیں' یہ قطعی غیر اہم ہے۔ وہ ردی اشیاء اور تھوک پھینک کر اسے گندا کر دیتا ہے۔ وہ لاپرواہ ہے۔ وہ نفاست کے کسی عمل میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ بہرحال گھنٹی بجنے پر کچھ دیر بعد چھوڑ جاتا ہے نا! اسی طرح ہم زندگی کو ایک عارضی قیام گاہ سمجھتے ہیں۔ رجحان یہ ہے کہ آخر کیوں اس میں خوب صورتی اور سچ کو تلاش کرنا ضروری ہے؟ .... لیکن میں زور دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ یہ زندگی اپنے وقت پر ختم ہو جائے گی لیکن "حقیقی" زندگی سے فرار قطعاً" ممکن نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم اس گھر' اس جگہ کو بدل دیں لیکن زندگی کا جوہر لازماً" ہمارے ساتھ رہے گا۔ اور وہ ہے ہماری "ذات"۔ اس سے چھٹکارہ پانے کا قطعی طور پر کوئی طریقہ نہیں ہے۔

ہم جو کچھ کرتے ہیں اسی میں ڈھل جاتے ہیں۔ بالآخر ہمارے اعمال ہی زندگی کو سنوارتے یا بگاڑتے ہیں۔ وہ زندگی بناتے ہیں' وہ اس کی صورت گری کرتے ہیں اور روح کو ڈھالتے ہیں۔ ہم اپنی زندگی سے جس طرح سے جو کچھ کرتے ہیں وہی ہمارے مستقبل کو اشارہ اندازی کرتا ہے۔ زندگی کی طرف ہمارا رجحان ہماری روح کی رہنمائی کرے گا۔ یہ کیسے ارتقا کرے گی' کب تک یہ اپنے رمز آشکار کرے گی؟ اگر ہم آگاہ ہوں کہ زندگی کی طرف ہماری ذہنیت ہمیں مستقبل کے لئے ڈھالتی ہے تو ہم فوری طور پر اس افسردہ نکتہ نظر کو ترک کر دیں کہ زندگی بے آہنگ' بے مصرف اور بے معنی ہے۔ تب ممکن ہے ہم اس یقین کے جھوٹے ہونے کا ادراک کریں کہ وجود ابتلا ہے .... اشیا کی کوئی سکیم نہیں ہے۔ تب ممکن ہے ہم جان لیں کہ جو کچھ زندگی کے خلاف ہے وہ لاذہنیت ہے۔

لیکن مذہب کے نام پر ہمیں زندگی کی نفی کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ مذہب کا فلسفہ زندگی اساس ہونے کی بجائے مرگ اساس ہے۔ اس نے پرچار کیا ہے کہ جو کچھ زندگی کے بعد ہے وہ اہم ہے جبکہ موت سے پہلے جو کچھ ہے وہ غیر اہم ہے .... مذہب نے آج تک موت کی پوجا کی ہے مگر زندگی کا کوئی احترام نہیں دکھایا۔ زندگی کے پھولوں اور پھلوں کی مسرت انگیز قبولیت کہیں نہیں ہے اور مردہ پھولوں کے لئے اہل عقیدہ ہر کہیں ہے۔ یہ مردہ پھولوں کی قبر پر نغمہ سرائی ہے! .... مذہب کی توقعات کا ارتکاز موت کے پرلی طرف یعنی جنت' نجات (موکش' نروان) کی طرف ہی رہا ہے۔ جبکہ موت سے پہلے جو کچھ ہے اس سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تمہیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ اگر تم جو کچھ موت سے قبل ہے اس کے متعلق جاننے سے قاصر ہو تو آخر کس طرح زندگی کے بعد کی صورت حال کا سامنا کر پاؤ گے؟ یہ قطعاً" ناممکن ہے! اگر ہم موت سے قبل جو کچھ ہے اسے حاصل نہیں کر سکتے۔ تو ہم موت کے بعد

جو کچھ ہے اس کو پانے کے بھی اہل نہیں ہو سکتے۔ موت کے لئے تیاریاں بھی زندگی میں' زندگی کے اردگرد اور زندگی کے دوران میں ہی ممکن ہیں۔ اگر موت کے بعد کوئی جہان ہے تو وہاں بھی ہم اسی سب کچھ سے دوچار ہوں گے جس کا کہ ہم نے اس زندگی میں تجربہ کیا ہے۔ اس زندگی کو اپنانے سے انکار' اس وجود سے لاتعلقی کا راگ الاپنے کے باوجود ان مابعد اثرات سے ضرور ممکن نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں اس زندگی سے ورے کوئی "ورائے ذات" یا خدا نہ تو ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے۔ میں یہ بھی دعویٰ کرتا ہوں کہ زندگی کی مدح و ثنا کرنا ہی "سادھنا" (ریاضت) ہے۔ زندگی کو اپنانا ہی حقیقی مذہب ہے۔ زندگی میں حتمی سچ کا ادراک ہی نجات پانے کا پہلا مبارک قدم ہے۔ جو شخص زندگی کو ضائع کرتا ہے وہ کسی شے کے لئے بھی پریقین ہو جائے۔ لیکن رجحان اس کے قطعاً" برخلاف رہا ہے یعنی زندگی کو ترک کرنا' دنیا سے قطع تعلق کرنا۔ مذہب زندگی میں دھیان دینے کی ہدایت نہیں کرتا' یہ زندگی بسر کرنے کی تربیت نہیں دیتا یہ بالکل واضح نہیں کرتا کہ تم زندگی کو صرف اسی طریقے سے پا سکتے ہو جس طریقے سے اسے بسر کرتے ہو۔ زندگی دست نگر نظر آتی ہے تو اس کی وجہ زندگی کا غیر خالص تناظر ہے۔ اگر زندگی بسر کرنے کا درست طریقہ معلوم ہو جائے تو زندگی مسرتوں کی برسات کر دیتی ہے۔

میں مذہب کو "زندگی کا فن" کہتا ہوں۔ مذہب زندگی سے دست برداری نہیں ہے بلکہ یہ تو وجود کے اسرار کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہونے کا ذریعہ ہے۔ مذہب زندگی سے منہ پھیرنے کا نہیں بلکہ زندگی کا سامنا کرنے کا نام ہے۔ مذہب فرار نہیں بلکہ زندگی سے مکمل ہم آغوشی ہے۔ یہ زندگی کا کامل ادراک ہے۔ بنیادی مغالطے کا براہ راست نتیجہ ہے کہ صرف بوڑھے لوگ مذہب میں دلچسپی ظاہر کرتے ہیں۔ تم صرف بوڑھے لوگوں کو خدا کی جگہوں ----- مقبروں' گرجوں' گردواروں' مسجدوں وغیرہ

میں پاؤ گے۔ تم جوانوں کو وہاں نہیں پاؤ گے! تم بچوں کو وہاں نہیں پاؤ گے! کیوں؟ ------ اس کی صرف ایک وضاحت کی جاسکتی ہے کہ ہمارا مذہب صرف معمر افراد کا مذہب بن کر رہ گیا ہے۔ یہ ان کا مذہب ہے جو اپنی زندگیوں کے اختتام کو پہنچ چکے ہیں اور موت کے خوف سے لرزہ براندام ہیں۔ وہ موت کے بعد کے مناظر کا تصور کر کے اندیشگی سے معمور ہیں۔ سو مرگ اساس مذہب کیوں کر زندگی کو اجال سکتا ہے۔

پانچ ہزار برس کی مذہبی تعلیمات کے بعد بھی یہ دنیا مسلسل بد سے بدترین کی طرف گامزن ہے۔ اگرچہ اس سیارے پر معبدوں ' مسجدوں' گرجوں' پروہتوں' معلموں' درویشوں وغیرہ کی کوئی کمیابی نہیں ہے مگر لوگ ابھی تک مذہبی نہیں بن سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہب کی اساس جھوٹی ہے۔ مذہب کی اساس زندگی نہیں ہے۔ مذہب کو موت سے بنا گیا ہے۔ یہ حیات افروز علامت نہیں ہے بلکہ قبرستان کا کتبہ ہے۔ یہ متعصبانہ مذہب زندگی کو جلا نہیں بخش سکتا------ اس سب کچھ کی کیا وجہ ہے؟

اب میں زندگی کے مذہب کے متعلق تفصیلاً" بتاؤں گا۔ اس کا بنیادی اصول بھی بیان کروں گا۔ ایک عام آدمی اس اصول کے متعلق جان کر متاثر نہیں ہوگا۔ ماضی میں زندگی کے اس قانون کو چھپانے' اس سچ کو دبانے کے لئے بہت کچھ کیا گیا اور اس مہلک غلطی کا نتیجہ ایک آفاقی مرض کی صورت میں پروان چڑھا ہے۔ اوسط عمر کے ایک انسان کی زندگی کا مرکزی عنصر کیا ہوتا ہے؟ خدا؟ ----- نہیں۔ روح؟ ------ نہیں۔ سچ؟ ----- نہیں۔ انسان کی نہاد میں کیا ہے؟ ایک عام آدمی کے بطون باطن میں کونسی تمنائے زیست ہے ---- اس اوسط آدمی کی زندگی میں جو کبھی مراقبہ نہیں کرتا' کبھی روح کو تلاش نہیں کرتا' کبھی مذہبی سفر پر نہیں نکلتا؟ وفا شعاری؟------ نہیں۔ عبادت؟ نہیں۔ آزادی؟ ----- نہیں۔ نروان؟ ----- نہیں۔ قطعاً" نہیں۔ اگر ہم ایک عام انسان کی زندگی میں تمنائے زیست کو دیکھنے کی کوشش کریں تو نہ ہمیں

وفاشعاری ملے گی اور نہ خدا' نہ عبادت ملے گی اور نہ علم کی پیاس۔ ہمیں اس سے مختلف کوئی شے "پائیں گے' وہ شے جسے تغافل کا نشانہ بنایا گیا ہے' جس کا شعوری طور پر سامنا نہیں کیا گیا' جس کی کبھی قدر افزائی نہیں کی گئی .... یہ "کوئی شے" کیا ہے؟ اگر تم انسان کی اساس کا تجزیہ کرو تو کیا پاؤ گے؟ یہ "کوئی شے" جو انسان کے اندر جگمگا رہی ہے۔

انسان کو تو ایک طرف کرو اگر ہم جانوروں اور پودوں کی دنیا پر توجہ مرتکز کریں تو ہم ہر چیز کی نماو میں کیا پائیں گے؟ اس کی نشوونما کس سمت میں ہے؟ اس کی ساری توانائی ایک نیا بیج بنانے میں صرف ہوتی ہے۔ اس کا سارا وجود نیا بیج تشکیل دینے میں مصروف ہے! ایک پرندہ کیا کر رہا ہے؟ ایک جانور کیا کر رہا ہے؟ اگر ہم ساری کی ساری فطرت کا گہرا مشاہدہ کریں تو اس حقیقت کو پائیں گے کہ صرف ایک عمل جاری وساری تھے اور وہ ہے "تخلیق مسلسل" .... تخلیق نو کا عمل' نئی متنوع صور ذات کی تخلیق کا عمل۔ پھولوں میں زیرہ بیج ہوتے ہیں' پھلوں میں بھی بیج ہوتے ہیں۔ بیج کی منزل کیا ہے؟ بیج نشوونما پا کر پودا' پھول' پھل اور پھر بیج بنتا ہے اور یوں یہ چکر چلتا رہتا ہے۔ اس "جہان حیات" میں تخلیق نو کا عمل ہی ابدی ہے۔ زندگی ایک قوت ہے جو مسلسل اپنی تخلیق نو میں مصروف ہے۔ زندگی تخلیقیت ہے' ایک خود تخلیقی کا عمل ہے۔

یہی انسان پر صادق آتا ہے۔ ہم نے اس عمل کا اس جذبے کا نام بگاڑ کر جنس رکھ دیا ہے۔ اس کو شہوت کا نام بھی دیا گیا ہے۔ اس طرح نام رکھنا گالی دینے کے مترادف ہے۔ یہ ایک گالی بن چکی ہے۔ اور تحقیر کے اس عمل نے ساری فضا کو آلودہ کر دیا ہے۔ پھر یہ شہوت یہ جذبہ کیا ہے؟ جنس کی طاقت کیا ہے؟

نامعلوم زمانوں سے سمندری لہریں مسلسل آتی ہیں اور ساحل سے ٹکراتی رہتی ہیں۔ لہریں آتی ہیں' ٹکراتی ہیں اور لوٹ جاتی ہیں۔ دوبارہ وہ آتی ہیں' دھکیلتی ہیں'

لڑتی ہیں' منتشر ہوتی اور لوٹ جاتی ہیں۔ زندگی ارتقا کی آگے بڑھنے کی داخلی تمنا کی حامل ہے۔ یہ سمندری لہریں' زندگی کی لہریں ------ ایک طرح کے ان تھک پن کی حامل ہیں' کچھ حاصل کرنے کی مستقل کوشش ان میں ہے۔ وہ حاصل کی جانے والی شے کیا ہے؟ یہ بہتر پوزیشن کے حصول کی شدید خواہش ہے۔ یہ ایک جذبہ ہے انتہائی بلندیوں پر پہنچنے کا اس لا مختتم توانائی کے عقب میں زندگی ایک عظیم حیات' ایک عظیم تر حیات کے لئے کوشاں ہے۔

انسان کو کرہ ارض پر نمودار ہوئے زیادہ عرصہ نہیں صرف چند ہزار برس ہی ہوئے ہیں۔ اس سے قبل صرف جانور ہوتے تھے۔ جانوروں کو بھی وجود میں آئے بہت زیادہ مدت نہیں ہوئی۔ ان سے قبل ایک زمانہ تھا کہ یہاں جانور بھی نہیں تھے بلکہ پودے ہوا کرتے تھے۔ پودے بھی اس سیارے پر بہت طویل عرصے سے نہیں ہیں۔ ان سے بھی پہلے یہاں صرف چٹانیں' پہاڑ' دریا اور سمندر تھے۔

چٹانوں' پہاڑوں' دریاؤں اور سمندروں کی یہ دنیا کس لئے بے سکون تھی؟ وہ پودے پیدا کرنے کے لئے کوشاں تھی۔ بتدریج اور مسلسل پودے وجود میں آتے رہے۔ زندگی کی توانائی نے نئی شکل میں ظہور کیا۔ زمین سبزے سے معمور ہوگئی۔ زندگی کی تخلیق نو کا سلسلہ جاری رہا۔ پھول کھلتے' پھل اگتے لیکن پودے مضطرب تھے۔ وہ اپنے آپ سے مطمئن نہیں تھے۔ داخلی تمنا اس کے بعد کچھ مزید کی طلب گار تھی۔ وہ جانور اور پرندے تخلیق کرنے کے آرزو مند تھے۔ پھر.....جانور اور پرندے وجود میں آگئے۔ انھوں نے اس سیارے پر زمانوں قبضہ کئے رکھا' لیکن انسان ہنوز اس منظر نامے کا حصہ نہیں بنا تھا۔

انسان ہمیشہ وہاں تھا' موروثی طور پر جانوروں میں' جنم لینے کو حدیں توڑنے کے لئے بازو بڑھاتے ہوئے ...... پھر انسان طے شدہ وقت پر زندگی پا گیا۔ اب انسان

کہاں پہنچنا چاہتا ہے؟ انسان حیات نو کی تخلیق کے لئے مسلسل کوشاں ہے۔ ہم نے اس رجحان کو جنس کا نام دے دیا ہے۔ ہم اسے شہوت کا جذبہ کہتے ہیں۔ اس "شہوت" کی کیا جہت ہے' کیا مفہوم ہے؟ یہ تمنا ہے تخلیق کی --- حیات نو کو پیدا کرنے کی! انقام فی نفسہ اس میں نہیں ہے ---- لیکن کس لئے؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ انسان خود میں سے ایک بہتر انسان کی تخلیق کے لئے کوشاں ہے؟ زندگی کی خود سے اعلیٰ تر شکل کے لئے! ---- یہ سچ ہے کہ زندگی کی توانائی انسان سے کہیں بہتر ہستی کی توقع میں ہے۔ نطشے سے اوبندو تک' پتنجلی سے برٹرینڈرسل تک داناؤں کے بطون باطن میں ایک تخیل' ایک خواب پروان چڑھتا رہا ہے کہ کس طرح خود سے بھی اعلیٰ تر انسان کی تخلیق ہو سکتی ہے؟ ایک سپرمین (انسان کامل)! انسان سے زیادہ بہتر انسان کیسے پیدا ہو سکتا ہے؟

لیکن اس کے برعکس تخلیق نو کی تمنا کو ہزاروں برس سے برا بھلا کہا جارہا ہے۔ اس کا اعتراف کرنے' اسے تسلیم کرنے کی بجائے ہم اس کو گالیاں دے رہے ہیں۔ ہم نے اس کو انتہائی پستی میں گرا کر بے قابو کر دیا ہے۔

ہم نے اسے اخفا میں رکھا ہے اور ظاہر یوں کیا ہے گویا یہ ہے ہی نہیں' گویا انسانی زندگی میں' اشیا کی سکیم میں اس کی جگہ ہی نہیں ہے۔ ہرگاہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس تمنا سے زیادہ حیات آفریں کچھ نہیں ہے اور اسے اس کا جائز مقام ملنا چاہئے۔ انسان اس کو چھپاتے اور پیروں تلے روندتے ہوئے خود کو آزاد نہیں کروا سکتا۔ اس کے برعکس انسان نے خود کو انتہائی بری طرح جال میں الجھا لیا ہے۔ جبر نے الٹ نتائج پیدا کئے ہیں۔

ایک شخص نیا نیا سائیکل چلانا سیکھ رہا تھا۔ سڑک بڑی اور وسیع تھی۔ سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی چٹان پڑی تھی۔ سائیکل سوار خوف زدہ ہو گیا کہ وہ اس پتھر

سے جا ٹکرائے گا۔ حقیقت میں اس پتھر سے اس کے ٹکرا جانے کا کوئی امکان تھا ہی نہیں۔ یہاں تک کہ ایک اندھا آدمی بھی اس کھلی سڑک سے تمام خدشات کے باوجود بحفاظت گزر سکتا تھا۔ لیکن پتھر کے خوف کی وجہ سے سائیکل سوار نے صرف پتھر پر توجہ مرکوز کر دی۔ پتھر اس کے ضمیر پر چھا گیا۔ سڑک اس کی نظر سے اوجھل ہو گئی۔ وہ ہپناٹائز ہو گیا اور پتھر کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ اور آخرکار اس سے ٹکرا گیا۔ ایک اناڑی ہمیشہ اس پتھر سے یا کھمبے سے ضرور ٹکرا جاتا ہے جس سے محفوظ رہنے کی وہ زیادہ کوشش کرتا ہے۔ اگرچہ سڑک بڑی اور کھلی تھی اس شخص کو حادثہ کیونکر پیش آیا؟

ایک جاپانی نفسیات دان کی تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ ایک اوسط ذہن "قانون اثر متخالف" سے کنٹرول ہوتا ہے۔ ہم اسی شے سے ٹکراتے ہیں جس سے حفاظت کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ خوف شعور کا مرکز بن کر احتیاط میں ڈھل جاتا اور یہی خوف اساس احتیاط نقصان رساں ہوتی ہے۔ اسی طرح گزشتہ پانچ ہزار برس سے انسان خود کو جنس سے محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر کہیں ہر جگہ وہ جنس اور اس کی بہت سی شکلوں سے متصادم ہے۔ "قانون اثر متخالف" نے انسان کی روح کو اسیر کر لیا ہے۔

کیا تم نے کبھی توجہ نہیں دی کہ ہم جس شے سے پرہیز کی کوشش کرتے ہیں ہمارا ذہن ہپناٹائز ہو کر اس کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے۔ جن لوگوں نے انسان کو جنس کے خلاف تعلیم دی ہے وہی لوگ انسان کی جنسی ذہنیت کے مکمل ذمہ دار ہیں۔ انسان میں حد سے زیادہ جنسیت بگڑی تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ آج ہم جنس کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے بھی خوف محسوس کرتے ہیں۔ آخر اخلاقی طور پر ہم اس مضمون سے کیوں خوف زدہ ہیں؟ اس کا سبب یہ پیشگی "مفروضہ" ہے کہ جنس کے متعلق گفتگو کرنے سے انسان جنس زدہ ہو جاتا ہے۔ یہ نکتہ نظر بالکل غلط ہے' بہرحال جنس اور جنس زدگی میں نمایاں

فرق ہے۔ ہمارا معاشرہ جنس کے بھوت سے تبھی آزاد ہوگا جب ہم اس کے متعلق عقلی اور صحت مندانہ انداز سے گفتگو کریں گے۔ جنس کو اس کے تمام پہلوؤں سے سمجھنے کے بعد ہی ہم جنس سے ماورا ہو سکتے ہیں۔

تم کسی مسئلے سے آنکھیں بند کر کے نجات نہیں پا سکتے۔ وہ آدمی پاگل ہے جو سمجھتا ہے کہ آنکھیں بند کر لینے سے اس کا دشمن اس کے سامنے سے غائب ہو جائے گا۔ صحرا میں شتر مرغ اسی انداز سے سوچتا ہے۔ وہ اپنا سر ریت میں گھسیڑ لیتا ہے اور سوچتا ہے کہ جب تک وہ دشمن کو نہیں دیکھتا' دشمن وہاں سے غائب رہے گا۔ ایک شتر مرغ کی حد تک تو یہ طرزِ فکر قابلِ درگزر ہے مگر ایک انسان کا ایسا سوچنا ناقابلِ معافی ہے۔ جنس کے حوالے سے انسان کا طرزِ عمل شتر مرغ سے زیادہ بہتر نہیں ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اپنی آنکھیں بند کرنے سے' لاعلمی کے وسیلے سے' جنس غائب ہو جائے گی۔ اگر معجزے رونما ہو سکتے تو زندگی بہت آسان ہو جاتی' دنیا کا ساتھ دینا بہت سہل ہو جاتا۔ مگر افسوس شتر مرغ کے شترگرانے سے کچھ بھی تو غائب نہیں ہوا۔ بلکہ اس کے برعکس ہوا ہے' جس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم اس سے دوری کو مقدس سمجھتے ہیں کیونکہ اس کی کشش ہماری مزاحمت سے زیادہ طاقت ور ہے۔ کیونکہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم اس پر غلبہ نہیں پا سکتے' ہم اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ آنکھوں کا بند کر لینا کمزوری کا نشان ہے اور ساری انسانیت اس کے لئے خطاوار ہے۔

انسان نہ صرف جنس کی طرف سے آنکھیں بند کر چکا ہے بلکہ اس حوالے سے لاتعداد داخلی مناقشوں میں پھنس گیا ہے۔ اس الجھاؤ کے جو گھن تائج شمار کرنے کے لئے کافی نمایاں ہیں۔ ذہنی بیماروں نیوراتیوں کی نوے فی صد تعداد ان بیماری کا سبب جنس کا دباؤ ہوتا ہے۔ ہسٹیریا اور اس سے متعلقہ بیماریوں میں مبتلا عورتوں کی ننانوے فی صد تعداد جنسی عدم توازن کا شکار ہوتی ہے۔ آج کے انسان سے خوف'

شک' ابن زائی' دباؤ اور تناؤ کی بڑی وجہ جذبے کا' شہوت کا دباؤ ہے۔ انسان نے موروثی طاقت ور الڈتی ہوئی لہر سے نظر پھیر لی ہے۔ اس کو سمجھنے کی کوشش کیے بغیر صرف خوف سے ہم نے آنکھیں بند کر لی ہیں اور اس کا نتیجہ بہت تباہ کن رہا ہے۔ اس کو سمجھنے کے لئے انسان کو اپنے ادب کا' جو ذہن کا آئینہ دار ہوتا ہے' تجزیہ کرنا ہوگا۔ اگر مریخ سے یا چاند کوئی "انسان" یہاں آئے اور ہمارے ادب کا مطالعہ کرے' ہماری کتابیں اور شاعری پڑھے' ہماری پینٹنگز دیکھے تو وہ حیران ہو جائے گا۔ وہ اس لئے حیران ہوگا کہ ہمارے فنون اور ادب کا مدار صرف و محض جنس پر ہے۔ انسان کی تمام شاعری' ناول' میگزین اور کہانیاں جنس سے کیوں بھری ہوئی ہیں؟ ہر میگزین پر عورت کی نیم عریاں تصویر کیوں شائع کی گئی ہوتی ہے؟ یہ کیونکر ہوتا ہے کہ مرد کی بنائی ہوئی ہر مووی شہوت اور جذبے کے اردگرد گھومتی ہوتی ہے؟ وہ حیرت اور الجھن میں پڑ جائے گا۔ وہ آسمانی سیاح حیران ہو گا کہ آخر کیوں انسان جنس کے علاوہ کچھ بھی نہیں سوچ سکتا! وہ اس وقت دگنا حیران و پریشان ہوگا جب وہ کسی انسان سے ملے گا کیونکہ وہ اسے متاثر کرنے کی سخت کوشش کرے گا کہ وہ تو جنس کے وجود تک سے لاعلم ہے۔

اس کے برعکس انسان روح' خدا' جنت' نجات وغیرہ کے متعلق باتیں کرے گا۔ وہ جنس کے متعلق ایک لفظ بیان نہیں کرے گا۔ حالانکہ اس کی تمام تخلیقات جنس کے متعلق خیالات سے معمور ہوں گی۔ آسمانی نووارد اس نتیجے پر پہنچ کر حواس باختہ ہو جائے گا کہ انسان نے اس خواہش کی تسکین کے لئے ان گنت "آلات" ایجاد کیے ہوئے ہیں' جس خواہش کے متعلق وہ سرگوشی تک نہیں کرتا۔

مرگ اساس مذہب نے انسان کو جنس زدہ بنا دیا ہے۔ ہم نے ایک اور زاویے سے بھی انسان کو مجرو بنا دیا ہے اور وہ اعلیٰ آدرش!

ہم انسان کو تجرد ـــــ برہمچاریہ ـــــ کا سنہری کلس تو دکھاتے ہیں لیکن پہلی ہی

سیڑھی پر قدم مضبوطی سے رکھنے کے لئے رہنمائی فراہم نہیں کرتے تاکہ وہ بنیاد کو سمجھ سکے۔ سب سے پہلے تو ہمیں جنس ---- بنیادی تمنا کا اعتراف کرنا اور اس کو سمجھنا چاہیے۔ تبھی ہم اس سے بالاتر ہونے کی سعی کر سکتے ہیں۔ اور وہ رفعت پا سکتے ہیں جس سے تجرد کے مقام پر پہنچ سکیں۔ زندگی کی اس قوت کو' اس کی تمام شکلوں اور پہلوؤں سے سمجھے بغیر اس کو دبانے یا محدود کرنے کی تمام کوششیں انسان کو بیمار' بے ربط اور پاگل بنا دیں گی۔ ہم اس بڑے مرض پر توجہ نہیں دیتے اور بات کرتے ہیں تجربے کے اعلٰی آدرشوں کی۔ انسان کبھی اتنا بیمار' اتنا نیوراتی' اتنا ملول' اتنا فسردہ نہیں رہا۔ انسان مجروح ہے۔ اس کی جڑیں مسموم کردی گئی ہیں۔

ایک دفعہ میں ایک ہسپتال کے قریب سے گزر رہا تھا۔ میں نے ایک بورڈ پر لکھا ہوا دیکھا "یہاں ایک بچھو کاٹنے آدمی کا علاج ہوا۔ وہ صرف ایک دن میں صحت یاب ہو کر گھر لوٹ گیا"۔ ایک اور نوٹس پڑھا "ایک آدمی کو سانپ نے ڈس لیا۔ اس کا علاج کیا گیا اور وہ تین دنوں ہی میں صحت یاب ہو کر گھر لوٹ گیا"۔ ایک تیسری رپورٹ پڑھی ایک آدمی کو پاگل کتے نے کاٹ لیا۔ وہ گذشتہ دس دنوں سے زیر علاج ہے اور جلد ہی وہ تندرست ہوجائے گا۔"

وہاں ایک چوتھی رپورٹ بھی تھی کہ "ایک آدمی کو دوسرے آدمی نے کاٹ لیا۔ اس کو کئی ہفتے ہو چکے ہیں۔ وہ بے ہوش ہے اور اس کے صحت یاب ہونے کی بہت کم توقع ہے۔"

میں حیران ہوا۔ کیا کسی انسان کا کاٹنا اتنا زہرناک ہو سکتا ہے؟ اگر ہم مشاہدہ کریں تو ہمیں پتا چلے گا کہ شاید "عطائیوں" کی وجہ سے انسان میں بہت سارا زہر سرایت کر چکا ہے۔ اس کی سب سے نمایاں وجہ اس شے کو مسترد کرنا ہے جو انسان میں فطری ہے' جو اس کی بنیادی ہستی ہے۔ انسان میں پیدائشی تمناؤں کو مٹانے اور ختم کر دینے کی کوششوں میں ہم ناکام ہوئے ہیں۔ ان تمناؤں کی قلب ماہیت اور ارتقاع کی کوششیں

نہیں کی گئیں۔ ہم اس توانائی کو غلط طریقے سے کنٹرول کرنے پر مجبور کئے گئے ہیں یہ توانائی پگھلے ہوئے لاوے کی طرح ابل رہی ہے اور ہمیشہ بہہ نکلتی ہے۔ اگر ہم کسی لمحے لاپروا ہوجائیں تو یہ آدمی کو ڈگمگا کر گرا دے گی۔ لہٰذا کیا تم جانتے ہو کہ پھر اس وقت سب سے پہلے کیا ہوتا ہے جب یہ معمولی سا بھی راستہ پاتی ہے؟

میں اسے ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ ایک ہوائی جہاز کو حادثہ پیش آتا ہے۔ تم کہیں نزدیک موجود ہوتے ہو۔ تم دوڑ کر جائے حادثہ پر پہنچتے ہو۔ ملبے میں ایک جسم دیکھتے ہی سب سے پہلے تمہارے ذہن میں کیا خیال آئے گا؟ ---- یہ خیال کہ وہ ہندو ہے یا مسلمان؟ ---- نہیں۔ یہ خیال کہ یہ شخص ہندستانی ہے یا پاکستانی؟ ---- نہیں۔ تم سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں سب سے پہلے یہ جان لوگے کہ وہ آدمی ہے یا عورت۔ کیا تم جانتے ہو کہ یہ سوال تمہارے ذہن میں سب سے پہلے کیوں آتا ہے؟ یہ دبی ہوئی جنس ہے۔ جبر نے آدمی اور عورت کے مابین فرق کو نمایاں کر دیا ہے۔

ہو سکتا ہے تم کسی انسان کا نام' چہرہ یا قومیت بھول جاؤ۔ اگر میں تمہیں کبھی ملا ہوں تو میں تمہارا نام۔ تمہارا چہرہ' تمہاری ذات' تمہاری عمر' تمہارا مرتبہ بھول سکتا ہوں یہاں تک کہ تمہارے بارے میں سب کچھ بھول سکتا ہوں ---- لیکن کوئی شخص کبھی کسی کی جنس نہیں بھلا سکتا' یہ کہ آیا وہ مرد تھا یا عورت۔ کیا تم کبھی مغالطے میں پڑے ہو کہ جس سے ملے تھے' مثلاً" پچھلے سال دہلی کی طرف سفر کے دوران میں ٹرین میں' وہ مرد تھا یا عورت تھی۔ کیوں؟ جب تم کسی شخص کے متعلق سب کچھ بھلا بیٹھتے ہو تو آخر کیوں تمہاری یاد کا یہ پہلو تم سے بھلایا نہیں جاتا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جنس کی آگاہی کی جڑیں عین ہمارے ذہن میں پختہ نہیں۔ ہماری سوچ کے عمل میں گڑی ہوئی ہیں۔ یہ ہمیشہ حاضر ہے' ہمیشہ فعال ہے۔

ہمارا معاشرہ اور ہماری دنیا اس وقت تک صحت مند بالکل نہیں ہو سکتا جب تک آدمی اور عورت کے درمیان یہ فاصلہ' یہ آہنی پردہ موجود ہے۔ انسان اس وقت تک سکون نہیں پا سکتا' جب تک اس میں یہ آگ بھڑک رہی ہے اور وہ مضبوطی سے اس

پر بیٹھا ہوا ہے۔

انسان کو اسے دبانے کے لئے ہر لمحہ' ہر روز کوشش کرنی پڑتی ہے۔ جب تک ہم اس کا سامنا کرنے کو تیار نہیں ہوتے یہ آگ ہمیں جلاتی رہے گی۔ یہ آگ کیا ہے؟ یہ دشمن نہیں دوست ہے۔ اس آگ کی فطرت کیا ہے؟ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ ایک دفعہ ہم اس آگ کا ادراک کر لیں تو یہ دشمن نہیں رہے گی بلکہ دوست بن جائے گی۔ اگر ہم اس آگ کو جان لیں تو یہ ہمیں نہیں جلائے گی' یہ ہمارے گھروں کو حرارت بخشے گی' یہ ہمارے لئے غذا تیار کرے گی اور زندگی بھر کی دوست بھی بن جائے گی۔

لاکھوں برسوں سے بجلی آسمانوں پر چمک رہی ہے۔ کبھی کبھی یہ گرتی بھی ہے اور انسانوں کو ہلاک بھی کر دیتی ہے۔ کوئی شخص بھی یہ بات نہیں سوچ سکتا کہ کسی روز یہی شے ہمارے پنکھے چلائے گی' ہمارے گھروں کو روشن کرے گی۔ تب کوئی شخص بھی اس کے امکانات سے آگاہ نہیں تھا۔ آج یہ برق ہماری دوست بن چکی ہے۔ کیسے؟ ہم نے اس سے آنکھیں بند کی ہوتیں تو کبھی اس کے رازوں کو نہیں پا سکتے تھے' ہم اس سے کبھی فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے۔ یہ ہمیشہ ہماری دشمن اور ہمارے خوف کا سبب بھی رہ سکتی تھی۔ مگر انسان نے اس سے دوستانہ برتاؤ کیا۔ انسان نے اسے جاننے' اسے سمجھنے کے لئے خود کو تیار کیا اور آہستہ آہستہ ایک لافانی دوستی قائم ہو گئی۔ آج ہم اس بجلی کے بغیر مشکل ہی گزارا کر سکتے ہیں۔

انسان کے اندر جنس ---- لیبڈو ---- بجلی سے زیادہ تابندگی رکھتا ہے۔ مادے کا ایک معمولی سا ایٹم ایک لاکھ سے زیادہ انسانوں کے شہر ہیروشیما کو "فنا" کر سکتا ہے جبکہ انسان کی توانائی کا ایک ایٹم ایک نیا زندہ انسان "تخلیق" کر سکتا ہے! جنس ایٹم بم سے زیادہ طاقت ور ہے۔ کیا تم نے کبھی اس قوت کے لامحدود امکانات کے متعلق غور کیا ہے؟ اور یہ کہ ہم کیسے بہتر تخلیق کے لئے اس کی قلب ماہیت کر سکتے ہیں؟ انسان کا ایک جین ایک گاندھی' ایک مہاتما بدھ' ایک مسیح کی پیدائش کا ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ ایک آئن سٹائن اس سے جنم لے سکتا ہے' ایک نیوٹن اس سے ظہور پا سکتا ہے۔ جنسی

توانائی کے ایک انتہائی معمولی سے جز ثومے میں گاندھی جیسی قد آور ہستی پوشیدہ ہوتی ہے۔ مگر ہم جنس کو سمجھنے کا جھکاؤ ہی نہیں رکھتے۔ ہمیں معاشرے میں اس کے متعلق گفتگو کرنے کے لئے بے انتہا جرات خود میں پیدا کرنی پڑے گی۔ آخر وہ کس قسم کا خوف ہے جس نے ہمیں طاعون زدہ کر دیا ہے کہ ہم اس قوت کے متعلق جاننے کے لئے تیار نہیں جس سے ساری دنیا پیدا ہوئی ہے؟ یہ خوف کیا ہے؟ ہم اس قدر چوکس کیوں ہیں؟

ایک دفعہ بمبئی کی ایک محفل میں اس کے متعلق میں نے گفتگو کی تو لوگوں کو شدید دھچکا لگا تھا۔ مجھے بہت سے خط موصول ہوئے جن میں لکھا گیا کہ میں اس انداز سے گفتگو مت کیا کروں' بلکہ میں اس موضوع پر بات ہی نہ کیا کروں۔ میں حیران ہوا کہ آخر کیوں کسی کو اس موضوع پر بات نہیں کرنی چاہیے؟ جب یہ "تمنا" ہمارے اندر موروثی طور پر موجود ہے تو آخر کیوں ہم کو اسے جاننا نہیں چاہیے؟ جب تک ہم اس کے رویے کو نہیں سمجھیں گے' اس کا تجزیہ نہیں کریں گے ہم اس کو اعلیٰ سطح بلند کرنے کی امید کیونکر کر سکتے ہیں؟ اسے سمجھ کر ہی ہم اس کی قلب ماہیت کر سکتے ہیں' ہم اسے فتح کر سکتے ہیں' ہم اسے ترفع دے سکتے ہیں' لیکن اس کے نہ ہوتے ہوئے ہم مر نہیں جائیں گے اور خود کو اس سے آزاد کرانے کے اہل ہو جائیں گے۔ میرا موقف یہ ہے کہ جنہوں نے جنس کے متعلق گفتگو پر قدغنیں لگائی ہیں انہوں نے جنس کے شگاف میں ذلت و پستی کو دھکیل دیا ہے۔ وہ لوگ جو خوف زدہ ہیں اور چنانچہ انہوں نے خود کو قائل کر لیا ہے کہ وہ جنس سے "معصوم" ہیں' وہ لوگ دیوانے ہیں اور انہوں نے دنیا کو ایک بڑے پاگل خانے میں بدلنے کی سازش کی ہے۔

مذہب انسان کی توانائی کی قلب ماہیت پر توجہ دیتا ہے۔ مذہب انسان کی داخلی ہستی' نیک آرزوؤں اور تمناؤں میں ممکن طور پر بہترین طریقے سے شامل ہونے کا مقصد رکھتا ہے۔ یہ بھی سچ ہے کہ مذہب کو انسان کو پستی سے بلندی' اندھیرے سے روشنی' غیر حقیقی سے حقیقی' عارضی سے دائمی کی طرف رہنمائی کرنی چاہیے۔ لیکن کسی

جگہ پہنچنے کے لئے انسان کو نقطہ آغاز سفر کے متعلق علم ہونا لازمی ہے۔ ہمیں وہاں سے آغاز کرنا ہے جہاں ہم ہیں۔ لہٰذا "اس" جگہ کے متعلق پہلے جاننا بہت ضروری ہے۔ اور "یہ" اس وقت زیادہ اہم ہے بہ نسبت اس جگہ کے جہاں ہمیں پہنچنا ہے۔ اس اعتبار سے جنس ایک سچائی ہے' ایک ٹھوس عددی حقیقت ہے' ایک واقفیت ہے' ایک نقطہ آغاز سفر ہے۔ بہ صورت دیگر ہم ایک انچ بھی حرکت نہیں کر سکتے۔ ہم کھو جائیں گے' ہم ایک گھومنے والا بھولا بن جائیں گے' دائرے میں گھومتے رہیں گے' "قطعاً" کوئی ترقی نہیں کر پائیں گے۔

جیسا کہ میں نے آغاز میں تمہیں بتایا تھا' مجھے اس امر کا ادراک ہے ہم زندگی کی حقیقتوں کا سامنا کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں ...... اگر ہم کچھ کر بھی سکتے تو اور کیا ہوتا؟ مزید کیا حاصل کیا جا سکتا تھا؟ خدا اور روح کے متعلق سارا شور شرابا خالی خولی تخمین ہے۔ محض جھوٹی باتیں! حقیقت کا صرف علم حاصل کر کے کیا ہم اس سے بالاتر ہو سکتے ہیں۔ درحقیقت' علم ماورائیت ہے۔

سب سے پہلے تو اس حقیقت کا مکمل ادراک ہونا چاہیے کہ آدمی جنس سے ہی وجود پذیر ہوا ہے۔ اس کی کل ہستی کا مدار جنسی مشغولیات پر ہے اور وہ جنس کی توانائی سے معمور ہے۔ زندگی جنس کی توانائی ہے۔ جنس کی توانائی کیا ہے؟ اس نے کیوں ہماری زندگی میں اتنی شدت سے ہیجان برپا کر دیا ہے؟ یہ ہمارے پورے وجود پر اس قدر کیوں چھا چکی ہے؟ ہم موت تک اس کے گرد کیوں گھومتے رہتے ہیں؟ اس کشش ثقل کا سرچشمہ کہاں ہے؟

داناؤں اور عاقلوں نے ہزاروں برس اسے مطعون کیا ہے لیکن نقصان انسان کا ہوا ہے۔ وہ زمانوں نے اس کی راہ روکنے کے لئے' اس کی سوچوں اور خواہشوں کو ختم کرنے کے لئے' اس "واہمے" سے آزاد کرانے کے لئے تبلیغ کر رہے ہیں۔ تاہم انسان اس کی بیڑیاں توڑنے کے قابل نہیں ہو سکا۔ تم اس کے مانند آزاد نہیں ہو سکتے۔ ہماری رسائی ہی غلط ہے۔ اس کے برعکس جب بھی میں طوائفوں سے ملا ہوں انہوں نے خدا

اور روح کے متعلق سوالات پوچھے۔ میں زاہدوں اور عبادت گزاروں سے بھی ملتا ہوں۔ جب ہمیں خلوت میسر آئی ہے تو وہ جنس کے سوا اور کچھ بھی نہیں پوچھتے۔ میں یہ جان کر حیران ہوا کہ زاہد جو ہمیشہ جنس کے خلاف تبلیغ کرتے ہیں ان کے ضمیر اس کے قبضے میں دکھائی دیتے ہیں۔ وہ متجسس اور ہیجان زدہ ہوتے ہیں۔ ان میں یہ ذہنی الجھاؤ (کمپلیکس) ہوتا ہے حالانکہ وہ مذہب کے علاوہ انسان کی حیوانی جبلتوں پر وعظ دیتے ہیں۔ اور ایسا بالکل فطری ہے کیونکہ ہم نے اس مسئلے کو حل کرنے کی خواہش یا کوشش ہی نہیں کی۔ ہم نے جنس کی تخلیقی کشش کے متعلق تحقیق ہی نہیں کی۔

تمہیں جنس کون سکھاتا ہے؟ تمام دنیا اس کی تعلیمات کے خلاف ہے۔ والدین محسوس کرتے ہیں کہ بچوں کو اس کے متعلق جاننے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔ اساتذہ بھی ایسا کرتے ہیں۔ صحیفے بھی یہی کہتے ہیں۔ جنس کا مضمون نہ کسی سکول اور نہ کسی یونیورسٹی میں پڑھایا جاتا ہے۔ ہر تعلیمی ادارہ اس کے متعلق جاننے سے روکتا ہے۔ لیکن بلوغت کے مرحلے میں انسان محسوس کرتا ہے کہ اس کا سارا وجود ---- پر ان جنس کے اضطراب سے بھر گیا ہے۔ ساری عمر کی پیش بندیاں دھری رہ جاتی ہیں اور جنس فتح پاتی ہے۔ یہ کیوں کر وقوع پذیر ہوتا ہے؟ محبت کا سچ اور محبت میں سچ کی تبلیغ کی جاتی ہے لیکن وہ قائم نہیں رہتے بلکہ آسان ہدف ثابت ہوتے ہیں۔ یہ ایک متاثر کن ثبوت ہے کہ جنس ذہن میں مضبوطی سے جڑیں پکڑے ہوئے ہے۔ پھر لنگرگاہ کہاں ہے؟ اس انتہائی طاقتور اور گہری فطری کشش ثقل کا مرکز کہاں ہے؟ رمزیت یہی تو ہے اور یہ ضروری ہے کہ اس کو تسلیم کیا جائے تاکہ ہم اس سے بالاتر ہو سکیں۔

درحقیقت بنیادی طور پر جو کچھ ہم جنس کی کشش کے طور پر محسوس کرتے ہیں وہ جنس کی کشش نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر بار خلاصی کے بعد انسان خود کو نچڑا ہوا' خالی اور مضمحل محسوس کرتا ہے' وہ آئندہ اس عمل سے بچنے کا سوچتا ہے۔ ذہن کی یہ کیفیات کہاں سے آتی ہیں؟ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ خواہش کسی اور ہی شے کے لئے ہوتی ہے' یہ محض جسمانی تسکین کے لئے نہیں ہوتی۔ عام انسان اپنے

ہستی کی تھاہ کا ادراک ہی نہیں کر سکتا جس وقت وہ جنسی عمل کے عروج کو پہنچا ہوا ہوتا ہے۔ روزمرہ کی معمول کی زندگی میں انسان مختلف تجربات سے گزرتا ہے۔ وہ خریداری کرتا ہے' کاروبار کرتا ہے' روزی کماتا ہے لیکن جنسی اختلاط اسے تجربے کی عمیق ترین گہرائیوں سے روشناس کرواتا ہے۔ نیز یہ واقعہ اس کے لئے گہری مذہبی جہت لئے ہوتا ہے۔ اس کی دو باتیں رونما ہوتی ہیں ----- اول انسان خود سے پرے جا پہنچتا ہے' دوم خود سے بالاتر ہو جاتا ہے۔

ملاپ میں سب سے پہلے انا غائب ہو جاتی ہے' بے انائی جنم لیتی ہے۔ ایک لمحے کے لئے ہی سہی "ذات" کہیں نہیں ہوتی' ایک لمحے کے لئے ہی سہی کسی کو بھی اپنا آپ یاد نہیں رہتا۔ کیا تم جانتے ہو کہ مذہب کے تجربے کے دوران میں "میں" مکمل طور پر تحلیل ہو جاتی ہے؟ کیا تم جانتے ہو کہ انا معدومیت میں بدل جاتی ہے؟ ایسے ہی جنسی تجربے میں تفاخر رخصت ہو جاتا ہے۔ یہ خود شناسی کا ایک مرحلہ ہے۔

جنس کے تجربے میں دوسرا عنصر یہ ہے کہ ایک لمحے کے لئے ہی سہی وقت رک جاتا ہے' "عدم وقتی" جنم لیتی ہے۔ حضرت عیسیٰ نے سادھی (مراقبے) کے بارے میں کہا تھا کہ "وقت اس دوران میں نہیں رہے گا"۔ وقت کا شعور معدوم ہو جاتا ہے۔ کوئی ماضی نہیں' کوئی مستقبل نہیں' صرف لمحہ موجود ہے۔ حال وقت کا حصہ نہیں ----- یہ تو ابدیت ہے۔ یہ ہے وہ دوسرا عامل جس کی وجہ سے انسان جنس کا نہ صرف مشتاق بلکہ اس کے لئے پاگل ہوتا ہے۔ مرد کو عورت یا عورت کو مرد کے بدن کی طلب نہیں ہوا کرتی۔ یہ جذبہ تو کسی اور ہی شے کے لئے ہوتا ہے اور وہ ہے بے انائی اور عدم وقتی! یہ کلائمیکس ایک لمحے کا ہی ہوتا ہے مگر آدمی اس کے لئے توانائی کی ----- حیاتیت کی کافی مقدار ضائع کرتا ہے۔ اور بعد میں اس ضیاع کا ماتم بھی کرتا ہے۔ کچھ جانوروں میں تو محض ایک جفتی کے بعد نر مر جاتا ہے۔ افریقہ میں ایک کیڑا صرف ایک بار فعل کرتا ہے' توانائی ختم ہو جاتی ہے اور وہ دوران عمل میں ہی مر جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انسان یہ نہیں جانتا ہے کہ اختلاط کا عمل قوت کو کمزوری میں بدلتا ہے' توانائی کم

کرتا ہے اور یہ کہ موت نزدیک تر آجاتی ہے۔ انسان اپنے ملوث ہونے پر پچھتاتا ہے مگر کچھ ہی مدت بعد وہ دوبارہ آرزو مند ہو جاتا ہے۔ یقیناً آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے اس سے زیادہ گہرے معانی اس رویے میں پنہاں ہیں۔

جنسی تجربے میں نرے جسمانی معمول کی نسبت زیادہ لطیف شعور موجود ہے۔ ایسا شعور جو کہ جوہری طور پر مذہبی ہے۔ ہمیں اس تجربے کی معنویت پر گرفت نہیں حاصل کر پائیں گے تو ہم صرف اور محض جنس میں جئیں گے' جنس ہی میں نشوونما پائیں گے اور مر جائیں گے۔

بجلی رات کی تاریکی میں چمکتی ہے لیکن رات کی تاریکی' بجلی نہیں ہے۔ دونوں کے مابین رشتہ صرف اتنا ہے کہ بجلی صرف رات میں ہی' تاریکی میں ہی چمکتی ہے۔ لیکن جبلت یہ نہیں ہے اور یہ بات بہت کچھ جنسی تجربے پر صادق آتی ہے۔ یہ ادراک' یہ الفرویننٹ جنس ہی میں چمکتی ہے' لیکن یہ مظہر فی نفسہ جنس (یا شہوت) نہیں ہے۔ اگرچہ یہ اس سے "منسلک" ہے' یہ ایک عملی قدر ہے۔

اگر ہم ماورا کے اس تجربے کا ادراک کر سکتے ہیں تو ہم جنس سے بالاتر ہو سکتے ہیں بصورت دیگر یہ ممکن نہیں ہے۔

لیکن جو لوگ جنس کی اندھی مخالفت کرتے ہیں وہ اس مظہر کی موزوں تناظر میں تعریف نہیں کر سکتے۔ وہ اس ناقابل تسکین خواہش اس طلب یعنی جنس کی وجہ کا تجزیہ نہیں کر سکتے۔ میں جس بات پر زور دے رہا ہوں وہ یہ ہے کہ جنس کا بار بار شدت سے عود کر آنا سادھی (مراقبے) کا لمحاتی ادراک ہے۔ اور تم خود کو جنس سے آزاد کرا سکتے ہو اگر تم جنس کے لازمے کے بغیر سادھی کی کیفیت پالو۔ اگر ایک انسان جو کسی شے کا حامل ہے' ایک ہزار روپے مانگتا ہے تو اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسی شے کی کان منت دینے کے لئے اس کے پاس ہے۔ کوئی بھی ہوش مند انسان اسے مہنگے داموں بازار سے خریدنے نہیں جائے گا۔ اگر کوئی انسان ویسی سرخوشی و کیف جیسی وہ جنس سے حاصل کرتا ہے' کسی دوسرے ذریعے سے حاصل کر سکتا تو اس کا ذہن متبادل سمت میں

جانے کے لئے آمادہ ہوتا۔

انسان کو سمادھی کا اولین ادراک صرف و محض جنسی تجربے کے ذریعے ہوتا ہے۔ لیکن یہ ایک مہنگا سودا ہے' ایک انتہائی مہنگا سودا! اور پھر یہ بھی تو ہے نا! کہ یہ ایک لمحے سے زیادہ ہوتا بھی نہیں۔ ہم ایک لمحاتی کلائمکس کے بعد پہلے والی کیفیت ہی پر لوٹ آتے ہیں۔ ایک سیکنڈ کے لئے ہم وجود کے ایک مختلف مقام پر پہنچتے ہیں' ہم بے انتہا تسکین کی طرف جست لگاتے ہیں۔ مومینٹم تو بلندی کی طرف ہوتا ہے لیکن بمشکل آغاز ہی کرپاتے ہیں کہ واپس پستی میں آ گرتے ہیں۔ ایک لہر آسمان کی طرف اٹھنے کے لئے آرزو کرتی ہے' یہ بمشکل کسی قدر بلند ہوتی ہی ہے کہ نیچے آنا شروع ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح کیف کے لئے' اس خوشی کے لئے' اس ادراک کے لئے ہم وقفے وقفے سے توانائی جمع کرتے ہیں اور دوبارہ اوپر چڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن ہمیشہ کی طرح اس میں ناکام رہتے ہیں۔ ہم اس رفیع اقلیم' اس لطیف سطح کو تقریباً" چھوتے ہی ہیں کہ دوبارہ اپنے ابتدائی مقام پر لوٹ آتے ہیں' لیکن توانائی کی ایک قابل لحاظ مقدار صرف کرنے کے بعد! جب تک انسان کا ذہن جنس کے بہاؤ میں غرق رہے گا وہ بار بار اس مدوجزر سے دوچار ہوگا۔ زندگی شعوری یا غیر شعوری طور پر "حب انائی" اور "عدم وقتی" کے لئے مسلسل کوشاں ہے۔ وجود کی شدید خواہش اپنی "حب حقیقی ذات" کو جاننا ہے' حق کو جاننا ہے اس اصلی سرچشمے کو جاننا ہے جو ابدی ہے' لازمانی ہے۔ یہ اس سے اتصال کی خواہش ہے جو وقت سے ماورا ہے' خالصتاً" ہے انا ہے۔

روح کی اس داخلی خواہش کی تسکین کے لئے دنیا جنس کے محور کے گرد گھوم رہی ہے۔ لیکن کیا ہم اس ادراک کے طلوع کے ساتھ ایک باطنی سمبندھ قائم کرسکتے ہیں' سمجھ سکتے ہیں' پروان چڑھا سکتے ہیں اگر ہم فطری داخلی انسان کیر حقیقت کے وجود کو جھٹلا دیں؟ اگر ہم جنس کی مخالفت کرتے ہیں جیسا کہ ہم شدت سے کرتے ہی ہیں' تو یہ شعور کا مرکز بن جاتی ہے' اس سے ہم اپنے آپ کو آزاد نہیں کرا سکتے بلکہ ہم

اس سے مضبوطی سے بندھ جاتے ہیں۔ قانون اثر متخالف روبہ عمل آتا ہے۔ ہم اس سے بندھ جاتے ہیں گو ہم اس سے بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جتنا زیادہ ہم اس سے چھٹکارہ پانے کے لئے خود پر جبر کرتے ہیں اتنا زیادہ ہم اس میں پھنس جاتے ہیں۔

ایک آدمی بیمار ہوگیا۔ اس کی بیماری تھی بھوک لگنا۔ حقیقت میں تو یہ کوئی بیماری نہیں ہے' نہ ہی اس کو کوئی بیماری تھی۔ اس نے کہیں پڑھ لیا کہ روزہ رکھنا کار ثواب ہے اور کھانا گناہ ہے۔ اس کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ کھانا تشدد میں شامل ہے اور عدم تشدد کے عقائد کے خلاف ہے۔ ہوا یہ کہ اس نے کھانے کو گناہ سمجھتے ہوئے بھوک پر جتنا جبر کیا اسی تناسب سے بھوک نے اپنا آپ منوایا۔ وہ دو دو دن روزہ رکھتا اور اس کے بعد روزہ کھولنے پر ہر شے جو سامنے آتی پیٹوؤں کی طرح کھا جاتا۔ اس طرح سے کھانے کے بعد اسے ندامت ہوتی کہ اس نے تو اپنا عہد توڑ دیا۔ اس ندامت کے علاوہ پرخوری اور بسیار خوری بھی اس پر اپنے اثرات چھوڑتے۔ یوں اس کا عہد اس کے لئے دہری مصیبت کا باعث بن گیا۔ اس ندامت کی اذیت سے پیچھا چھڑانے کے لئے وہ کفارے کے روزے رکھتا اور روزے کھولنے پر پہلے ہی کی سی پرخوری اور بسیار خوری کا مظاہرہ کرتا اور پھر سے ندامت اور بدہضمی کا شکار ہو جاتا۔

بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ گھر میں رہتے ہوئے حق کی راہ پر چلنا ممکن نہیں۔ اس نے دنیا ترک کر دی اور جنگل میں ایک پہاڑی کے اوپر ایک تنہا مقام ڈھونڈ کر رہنے لگا۔ روزے رکھ کے ثواب کمانے اور گناہ گھٹانے لگا۔ ادھر اس کے گھر والے اس کے لئے اداس تھے۔ اس کی بیوی سوچتی وہ اس تیاگ میں کھانے کی بیماری پر ضرور حاوی ہو جائے گا۔ بیوی نے خاوند کی جلد صحت یابی اور جلد گھر واپسی کی دعاؤں کے ساتھ اسے ایک گلدستہ بھجوایا۔

وہ آدمی شکریے کے ان الفاظ کے ساتھ واپس آیا۔ "پھولوں کا بہت شکریہ' وہ بہت لذیذ تھے۔" وہ آدمی ان پھولوں کو بھی کھا گیا تھا۔ ہم غذا کی جگہ پھول کھانے والے کسی آدمی کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہم نے کبھی اس آدمی کی طرح

روزے کی سادھنا نہیں کی ہے۔ ہاں وہ لوگ جو کھانے ہی کے لئے وقف ہیں اس آدمی کی حالت کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

ہر آدمی کم یا زیادہ تناسب کے ساتھ جنس سے جڑا ہوا ہے۔ جنس کے ساتھ جنگ کا آغاز کرتے ہوئے سارے کے سارے انسان جنس کے نام پر جو کچھ بھی "کھا" چکے ہیں اس کے متعلق درست اندازہ لگانا دشوار ہے۔ کیا انسان کے مہذب معاشرے کے علاوہ کسی جگہ ہم جنس پرستی ہوتی ہے؟ قدیم ترین' ابتدائی انسان جو پسماندہ علاقوں میں رہتے ہیں' اس امر کا تصور بھی نہیں کرسکتے کہ کوئی آدمی دوسرے آدمی سے جنسی فعل کر سکتا ہے! میں قبائلی لوگوں کے ساتھ رہا ہوں اور جب میں نے انھیں بتایا کہ مہذب انسان ایسا بھی کرتے ہیں تو وہ سن ہو کے رہ گئے۔ وہ اس بات کا یقین ہی نہیں کر سکے۔ لیکن مغرب میں تو ہم جنس پرستوں کے کلب کھل گئے ہیں۔ ان کی تنظیم دعویٰ کرتی ہے کہ جب اکثریت اس فعل کو سرانجام دیتی ہے تو اس پر قدغن لگانا بنیادی انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے۔ یہ اکثریت پر اقلیت کا جبر ہے۔ اس ذہنیت یعنی ہم جنس پرستی کی پیدائش' جنس کے ساتھ جنگ کا نتیجہ ہے۔ طوائفیت ہماری تہذیب سے براہ راست تعلق رکھتی ہے۔ کیا تم نے کبھی طوائفیت کے ادارے کے وجود پذیر ہونے کے متعلق سوچا ہے؟ تم قبائلی لوگوں کی پہاڑی علاقوں میں واقع الگ تھلگ بستیوں میں کوئی طوائف نہیں پاؤ گے' یہ قطعی ناممکن ہے۔ وہ تو اس امر کا تصور تک نہیں کر سکتے کہ ان کے ہاں ایک ایسی عورت بھی ہو سکتی ہے جو اپنی عصمت بیچتی ہو' جو معاوضہ لے کر مباشرت میں حصہ لیتی ہو۔ یہ روایت انسان کی "تہذیب کے ارتقا" کا نتیجہ ہے۔ یہ پجاریوں کو کھاتا ہے۔ اگر ہم دیگر جنسی کجرویوں اور ان کی کراہت انگیز صورتوں کی عملی نمود کا بیان کریں تو اس سے بھی زیادہ حیران ہوں گے۔

آخر انسان کے ساتھ ہوا کیا ہے؟ ان کراہت انگیز جنسی انحرافات کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جنھوں نے انسان کو تعلیم دی کہ جنس کو سمجھنا نہیں بلکہ دبانا ضروری ہے۔ اس جبر کی وجہ سے جنس کی توانائی غلط راستوں سے پھوٹ

رہی ہے۔ انسان کا پورا معاشرہ بیمار اور مصیبت زدہ ہو گیا ہے۔ اگر اس سرطان زدہ معاشرے کو بدلنا ہے تو یہ لازمی ہے کہ جنس کی توانائی کو الوہی تسلیم کیا جائے۔ جنس کی طلب کو گناہ نہیں ثواب سمجھا جائے۔ جنس کی طلب بہت طاقتور ہے۔ لیکن اگر ہم جنس کی اساس کو سمجھ لیں تو انسان کو جنس سے بالاتر کر سکتے ہیں۔ صرف اسی صورت میں کرما کی دنیا (انفس) سے راما کی دنیا (آفاق) ظہور کر سکتی ہے۔ ہوس سے عشق نمود کر سکتا ہے۔ میں اپنے کچھ دوستوں کے ہمراہ کھجوراہو کا مشہور عالم مندر دیکھنے گیا۔ مندر کی بیرونی دیوار پر مباشرت کے بہت سے پوز تصویروں میں دکھائے گئے تھے۔ وہاں جنسی تسکین کے عمل کے مختلف آسنوں میں کئی مجسمے موجود تھے۔ میرے دوستوں نے پوچھا کہ یہ مجسمے یہاں ایک مندر کے اردگرد کیوں موجود ہیں؟ میں نے انھیں بتایا کہ وہ ماہرین تعمیر جنھوں نے یہ مندر بنایا تھا بہت ذہین لوگ تھے۔ وہ یقین رکھتے تھے کہ زندگی کے بیرونی محیط میں جذبہ اور جنس ہوتا ہے۔ جو لوگ ہنوز جنس میں پھنسے ہوئے ہیں انھیں مندر میں داخلے کا کوئی حق نہیں ہے۔

ہم اندر داخل ہوئے۔ وہاں خدا کا بت موجود تھا۔ میرے دوست باہر جیسے مجسمے وہاں نہ پا کر بہت حیران ہوئے۔ میں نے انھیں بتایا کہ زندگی کی فصیل پر تو جنس شہوت ہوتی ہے۔ جبکہ اندر خدا کا گھر ہوتا ہے۔ جو لوگ جذبے ...... جنس سے ابھی تک ورغلائے ہوئے ہیں وہ اندر خدا کے گھر تک نہیں پہنچ سکتے' وہ ہنوز بیرونی دیوار کے اردگرد ہی مارے مارے پھر رہے ہیں۔

اس مندر کے معمار بہت ہی باشعور لوگ تھے۔ یہ مراقبہ گاہ ہے۔ جنسیت بیرونی سطح پر ہر جگہ ہے' سکون مرکز میں ہے۔ وہ روحانی ترقی کے آرزو مندوں کو بتایا کرتے تھے کہ جنس میں دھیان لگاؤ۔ بیرونی دیوار پر مکمل طور جنسی انضباط کرو۔ جب کوئی مکمل طور پر اس کو سمجھ جاتا اور اس کو یقین ہو جاتا کہ ذہن جنس سے آزاد ہو گیا ہے تو پھر وہ اندر داخل ہو سکتا تھا۔ تب وہ اندر خدا کے حضور حاضر ہو سکتا تھا۔

لیکن مذہب کے نام پر ہم نے جنس کو سمجھنے کے امکان کو برباد کر دیا ہے۔ ہم نے

جنس کے خلاف" اپنی بنیادی جبلت کے خلاف اعلان جنگ کر دیا ہے۔ یہ ایک اصول بنا دیا گیا ہے کہ جنس کو مت دیکھو بلکہ اس سے آنکھیں بند کر لو۔ اور پھر خدا کے مندر میں داخل ہو جاؤ۔ کیا کوئی بھی محض آنکھیں بند کر کے نہیں جا سکتا ہے؟! بجائے کہ جنس سے تم بھاگ رہے ہو اسے دیکھ پاؤ اگر تم بند آنکھوں کے ساتھ اندر رسائی پاؤ تو تم خدا کو بھی نہیں دیکھ سکو گے۔

شاید کچھ لوگ سوچیں کہ میں جنس کا پروپیگنڈا کر رہا ہوں۔ براہ مہربانی انھیں آگاہ کر دو کہ وہ مجھے نہ سنیں۔ کرۂ ارض پر تم اس وقت مجھ سے بڑا دشمن جنس نہیں پا سکتے۔ اگر وہ میرے کہے پر غیر جانبدارانہ توجہ دیں تو ممکن ہے کہ انسان جنس سے رہائی پا لے۔ بہتر انسانیت کا یہ واحد راستہ ہے۔ ہم جن پنڈتوں کو جنس کے دشمن سمجھتے ہیں وہ جنس کے دشمن نہیں بلکہ اس کا پروپیگنڈا کرنے والے ہیں۔ انھوں نے جنس کا کلچر تخلیق کر دیا ہے۔ جنس کی شدید مخالفت نے ایک جنون خیز ترغیب مہیا کی ہے۔

ایک آدمی نے مجھے بتایا کہ وہ ایسے کام ضرور کرتا ہے جنھیں مسترد کیا جاتا ہے' چیلنج کیا جاتا ہے اور جن کا برا منایا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں چوری کے پھل ہمیشہ ان پھلوں سے زیادہ میٹھے ہوتے ہیں جنھیں ہم نے بازار سے خریدا ہو۔ یہی وجہ ہے وہ ہماری اپنی بیوی ہمیں اتنی خوب صورت نہیں لگتی جتنی پڑوسی کی بیوی اچھی لگتی ہے۔ دوسرے کی بیوی کی مثال ایک چرائے ہوئے پھل' ایک ممنوعہ آئٹم جیسی ہے۔ جنس پر جھوٹ کے رنگین پوچے شدت سے پھیر دیے گئے ہیں۔ پس اس میں ہمارے لئے بے پناہ ترغیب پیدا ہو گئی ہے۔

برٹرینڈ رسل نے لکھا ہے کہ وکٹورین عہد میں' جب وہ بچہ تھا' عورتوں کی ٹانگیں عوامی جلسوں پر دیکھی نہیں جا سکتی تھیں۔ وہ جو لباس پہنتی تھیں اس سے ان کے پاؤں تک ڈھکے ہوئے ہوتے تھے اور کپڑا زمین پر سرک رہا ہوتا تھا۔ اگر کبھی اتفاقاً" کسی عورت کے پاؤں کا صرف پنجہ ہی نظر آ جاتا تو مرد بڑی مشتاق نظروں سے اسے تکتے

تھے۔ اس سے جذبے کو مہمیز ملتی تھی۔ رسل مزید لکھتا ہے کہ آج عورتیں تقریباً" نیم عریاں پھرتی ہیں۔ ان کی پوری ٹانگیں عریاں ہوتی ہیں لیکن ہمیں ترغیب نہیں دیتیں۔ وہ لکھتا ہے کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جتنا ہم کسی شے کو پوشیدہ رکھیں گے اتنا ہی تجسس فزوں ہو گا۔ لہٰذا دنیا کو جنسیت سے رہائی دلانے کے لئے پہلا قدم یہ ہونا چاہیے کہ بچوں کو گھروں میں ننگا رکھا جائے۔ لڑکے ہوں یا لڑکیاں بچوں کو ننگا ہی کھیلنے دیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کے جسموں سے اچھی طرح آشنا ہو جائیں تاکہ کل کلاں انھیں گلیوں میں ایک دوسرے کے چٹکی بھرنے' دھکا دینے یا ساتھ لپٹانے کی ضرورت ہی نہ ہو۔ تب کسی کتاب پر عریاں تصویریں چھاپنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ انھیں ایک دوسرے کے جسموں کے متعلق آگاہ ہونا چاہیے تاکہ آئندہ کسی نوع کی کجی پیدا ہی نہ ہو سکے۔

لیکن دنیا کے طور الٹ ہیں۔ جن لوگوں نے جنس کو پوشیدہ اور پنہاں کر دیا ہے انھوں نے احمقانہ طریقے سے اس میں اس قدر کشش پیدا کر دی ہے کہ ہم نے اس کی پوری طاقت کو ابھی تک محسوس ہی نہیں کیا۔ اس سے تو ہمارے ذہن چھلک رہے ہیں۔

بچوں کو طویل عرصے تک عریاں رہنا چاہیے' عریاں کھیلنا چاہیے تاکہ پاگل پن کا کوئی بیج ہی نہ رہے جو ان کی ساری زندگی اجیرن کر دے۔ لیکن نہ صرف بیماری موجود ہے بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس بیماری کا مظہر وہ فحش ادب ہے جو آج کل شائع ہو رہا ہے۔ لوگ اس کو گیتا اور بائبل کے کور میں چھپا کر پڑھ رہے ہیں۔ ہم شور مچاتے ہیں کہ فحش کتابوں پر پابندی لگاؤ لیکن ہم اس جذبے کے متعلق کبھی نہیں سوچتے کہ جہاں سے فحش مطالعہ کرنے والے لوگ آ رہے ہیں۔ ہم دیواروں پر فحش تصاویر کی نمائش کے خلاف احتجاج کرتے ہیں لیکن ذرا بھر بھی نہیں سوچتے کہ آخر ان کو نمایاں کیوں کیا گیا؟

جنس فطری ہے مگر جنسیت پیداوار ہے جنس مخالف تعلیمات کی۔ اگر ان تعلیمات

اور غیر سائنسی وعظوں پر عمل پیرا ہوا جائے تو انسانی روح مکمل طور پر جنسیت سے "آلودہ ہو جائے گی۔ اور ایسا تقریباً" ہو چکا ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس طرح کے معلمین انسانوں کو بہکانے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ ان کی ناکامی کی وجہ سے انسان کچھ ضمیر اور شعور بچانے کے قابل ہو گیا ہے۔

اگر کوئی انسان جنس کو درست طور پر سمجھ لیتا ہے تو وہ جنس سے بالاتر ہو سکتا ہے۔ اسے بالاتر ہونا چاہیے اور اس سے بالاتر ہونا ضروری بھی ہے۔ چونکہ ہم نے جنس کو دوست نہیں دشمن بنایا ہے اس لئے ہماری ہر کوشش غلط نتائج پیدا کرتی ہے۔ ہم نے جبر کا وطیرہ اختیار کیا ہے اور جنسی مسائل کو سلجھانے کا شعور پیدا نہیں کیا۔ جتنا شعور زیادہ ہوگا اتنا ہی انسان جنس سے بالاتر ہوگا۔ جتنا شعور کم ہوگا' جتنی زیادہ جنس کو دبانے کی کوشش ہوگی' جبر کے نتائج کبھی ثمر آور نہیں ہوں گے' کبھی خوشگوار نہیں ہوں گے' کبھی صحت مند نہیں ہوں گے۔

جنس انسان کی انتہائی تخلیقی توانائی ہے' جس کے اندر لامحدود امکانات نہاں ہیں۔ جنس کو روح تک رہنمائی کرنی چاہیے شہوت سے روشنی تک کا سفر اس کا نصب العین ہونا چاہیے۔ تجرد تک رسائی کے لئے جنس کا شعور ضروری ہے' اس سے آزادی کے لئے اس کو جاننا چاہیے۔ ایک انسان زندگی بھر کے جنسی تجربے کے بعد بھی یہ جاننے کے قابل نہیں ہوتا ہے کہ مباشرت "سمادھی" (مراقبہ) کا شعور اعلیٰ کی ایک جھلک دیکھنے کا ایک نہایت موزوں تجربہ ہے اور یہی ہے "وہ" کشش ثقل' عظیم ترین ترغیب! یہ خدا کا مقناطیسی بلاوا ہے۔ تمہیں اس کے متعلق جاننا اور لمحاتی حضوری میں "دھیان" کرنا چاہیے۔ تمہیں اس لئے کے متعلق شعوری غور و فکر کرنی چاہیے جو ہر کسی کو تحریک دیتی ہے۔

یہ سخت مشکل ہے! بہرحال اس تجربے کے حصول کے دوسرے ذرائع بھی ہیں — مراقبہ' یوگا' انتہائی دعا اس کے دیگر متبادل ہیں' لیکن صرف جنس کا ذریعہ ہی ہم پر سب سے زیادہ اثر ڈالتا ہے۔ کیوں؟ ...... نہایت ضروری ہے کہ ان مختلف

ذرائع کے بارے میں سوچا جائے جو اسی منزل پر پہنچا سکتے ہیں۔

میرے ایک دوست نے مجھے لکھا کہ میرا موضوع سخن بڑا شرمندگی افروز ہے۔ اس نے مجھے احساس دلایا کہ سامعین میں شامل اس ماں کی بیچارگی کا تصور کروں جو اپنی بیٹی کے ساتھ ہے۔ اس ماں کا تصور کروں جو اپنے بیٹے کی معیت میں میرا لیکچر سننے آئی ہوئی ہے۔ اس نے ہدایت دی کہ ایسے معاملات ہر کسی کے سامنے بیان نہیں کئے جانے چاہییں۔

میں نے جواب دیا کہ وہ اپنے حواس میں نہیں ہے۔ اس کے اعتراضات بے بنیاد ہیں۔ اگر ایک ماں باشعور ہے تو اسے اپنی بیٹی کو اپنے جنسی تجربات سے بروقت آگاہ کر دینا چاہیے' پیشتر اس کے کہ وہ جنس کی پستیوں میں پھسل جائے' اس سے پہلے کہ وہ انجانے ناپختہ' جعلی سائنسی جنسی مشاغل میں کھو کے رہ جائے۔ اگر ایک باپ اپنی ذمہ داری کرنے کا شعور رکھتا ہے تو اسے لازماً" اس موضوع کو اپنے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ زیر بحث لانا چاہیے۔ عمومی اندیشوں کے خلاف انہیں خبردار و ہوشیار کرنے کے لئے اور مستقبل میں ممکنہ کج رویوں سے ان کی زندگیاں محفوظ رکھنے کے لئے یہ ناگزیر ہے۔

لیکن حالات کی ستم ظریفی تو یہ ہے کہ ماں ہو یا باپ دونوں ہی معاملے کا گہرا شعور نہیں رکھتے۔ وہ دونوں بذات خود جنس کی جسمانی سطح سے بالاتر ہی نہیں ہوئے ہوتے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے ذاتی تجربے سے خوفزدہ ہوتے ہیں مبادا ان کے بچے اسی سطح پر پھنس نہ جائیں۔ لیکن میں پوچھتا ہوں تمہیں کس نے راہنمائی دی؟ تم خود میں پھنسے ہوئے ہو۔ بچے بھی خود میں پھنس جائیں گے۔ تمہارے بعد دوسری نسل میں بھی اس کا اعادہ ہوگا اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اگر انہیں وضاحت سے بتایا جائے' تعلیم دی جائے اور آزادانہ سوچنے کی اجازت دی جائے تو ممکن ہے وہ اپنی توانائی ضائع کرنے سے اپنے آپ کو باز رکھیں؟ ممکن ہے وہ اپنی توانائی کو بچالیں' ممکن ہے وہ اس کی قلب ماہیت کر لیں۔

ہم نے اکثر کوئلہ دیکھا ہوگا۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ چند ہزار برس کے عرصے میں کوئلہ ہیرے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ کوئلے اور ہیرے میں کیمیائی اور سائنسیاتی اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک ہیرا کوئلے کے ایک ٹکڑے کی قلب ماہیت ہے۔ ہیرا صرف اور محض کوئلہ ہے۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ جنس کوئلہ ہے جبکہ برہمچاریہ ...... تجرد ہیرا ہے۔ تجرد جنس کی نئی شکل ہوتی ہے۔ یہ جنس کی قلب ماہیت ہے یہ کوئلہ ہے لیکن ایک مخصوص عمل سے گزر کر تجرد کے ہیرے میں ڈھل گیا ہے۔ اور یقین کرو دونوں انتہاؤں کے درمیان کوئی معاندت نہیں ہے۔ جنس کا کوئی دشمن برہمچاریہ کا مقام نہیں پاسکتا۔

برہمچاریہ ...... تجرد سے ہم کیا مراد لے رہے ہیں؟ یہ "برہمن" کا "چاریہ" ہے' برہمن سے اتصال! اس کا مطلب ہے ایک الوہی تجربے کا ادراک' ایسا تجربہ جو خداداد ہے۔ شعوری ادراک سے اس توانائی کی قلب ماہیت ممکن ہے۔

اگلی مرتبہ میں تمہیں قلب ماہیت کے حصول کے متعلق بتاؤں گا۔ کس طرح کما (شہوت) کا تجربہ راما (نور) کے تجربے میں ترفع پاسکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں تم اسے غور سے سنو تاکہ غلط فہمی کا امکان نہ رہے۔ اور جو سوال تمہارے ذہن میں ابھریں ایمانداری سے مجھے لکھ بھیجو۔ میں ان کے جواب دوں گا۔ تمہارے ذہن میں جو سوالات ابھریں انہیں چھپانے کی کوئی وجہ نہیں ہے' یہ تو زندگی کے سچ کا چھپانا ہوا! اس سے فراریت نامناسب ہے۔ سچ تو سچ ہی رہے گا خواہ ہم اپنی آنکھیں بند رکھیں خواہ کھلی رکھیں۔ صرف وہ آدمی دیندار ہوتا ہے جو سچ کا سامنا کرنے کی جرأت رکھتا ہے۔ وہ لوگ جو کمزور ہیں' بزدل ہیں اور زندگی کے حقائق کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں رکھتے' ان کی دین دار بننے میں کوئی مدد نہیں کی جاسکتی۔

میں تمہیں اس پر سوچنے کی دعوت دیتا ہوں کیونکہ یہ میرا موضوع ہے جس پر پرانے داناؤں اور عاقلوں سے گفتگو کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ شاید تم ایسے معاملات کے بارے میں سننے کے عادی بھی نہ ہو' ردعمل میں تمہارا ذہن خوف سے بھر جانے کا

لیکن میں تمہارے معروضی طور پر سوچنے کی شدید خواہش رکھتا ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ جنس کی سمجھ بوجھ تمہیں روح کے معبد میں لے جائے۔ یہ میری آرزو ہے۔ خدا اس آرزو کو پورا کرے!

تیسرا باب

مراقبے کا کلس

جانِ عزیز!

میں ابتدا میں تمہیں ایک چھوٹی سی کہانی سنانا چاہتا ہوں۔ بہت عرصہ پہلے کسی ملک میں ایک نوجوان مصور رہتا تھا۔ اس نے تہیہ کیا کہ وہ ایک حقیقی شاہکار' ایک لافانی پورٹریٹ ایک خدا کی مسرت سے بھرپور تصویر بنائے گا۔ ایسی تصویر جس کی آنکھوں سے درخشاں ابدی سکون عیاں ہوتا ہو۔ وہ اپنے لافانی شاہکار کے لئے ماڈل کی تلاش میں سفر کو نکل کھڑا ہوا۔ وہ سارے ملک میں پھرا۔ اس نے شہر اور بستیاں تو کیا جنگلوں' صحراؤں اور غیر آباد مقامات تک کی خاک چھانی۔ اسے تلاش تھی ایک ایسے چہرے کی جس میں خدا کا عکس جھلکتا ہو۔ آخر کار اسے ایک چرواہا مل گیا جس کی آنکھیں تابندہ تھیں' جس کے خط وخال ملکوتی شان کے حامل تھے۔ اس کو ایک نظر دیکھتے ہی سے ادراک ہوتا تھا کہ خدا انسان میں جلوہ گر ہو سکتا ہے۔ مصور نے اس کا پورٹریٹ تخلیق کیا۔ یہ واقعی ایک شاہکار ثابت ہوا۔ اس کی لاکھوں نقلیں سارے ملک کے کونے کونے میں منگوائی گئیں۔ گھروں میں اس شاہکار کا آویزاں کیا جانا باعث تفاخر سمجھا جانے لگا۔ اس چہرے کی الوہیت' ملکوتیت' اور کمال معصومیت نے ہر دیکھنے والے کو مسحور کر دیا۔

بیس برس کے بعد مصور کو ایک اور اچھوتا خیال سوجھا۔ اس کے تخلیقی ذہن میں یہ خیال ابھرا کہ چونکہ اس کا تجربہ اسے بتاتا ہے کہ زندگی محض خیر نہیں ہے' انسان کے اندر شیطان بھی نہاں ہے' سو اس شیطان کی تصویر کشی کی جائے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ

اس شیطان والے پورٹریٹ کو پہلے والے لافانی خیر کے نمائندہ پورٹریٹ کے ساتھ یکجو کرنے ہی سے مکمل انسان کی تصویر کشی کی تخلیقی ذمہ داری ادا ہو سکتی ہے۔ اس کے اندر کی تخلیقی قوت بے چین ہونے لگی۔ وہ ایک بار پھر کسی ایسے چہرے کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا جو اسے ایک اور لافانی شاہکار بنانے میں ماڈل کے طور پر معاونت دے۔ چونکہ اس بار معاملہ شیطان کا تھا اس لئے وہ زیادہ تر انہی جگہوں پر گیا جہاں جرم کرنے والے یا جرم کی زندگی گزارنے والے لوگ ملتے ہیں۔ اس نے جمال الٰہی کا پرتو چرا تو بنا لیا تھا اور اب وہ شر کا پورٹریٹ بنانا چاہتا تھا۔

آخر کار اس کو ایک آدمی مل گیا جو آدمی نہیں گویا شیطان تھا۔ وہ بدکار' شرابی اور زانی تھا۔ یہ ماڈل جہنم کی آگ سے بھرا ہوا تھا' اس کا چہرا سوائے بدی کے اور کچھ منعکس نہیں کرتا تھا --- ایک مکروہ' بھدا اور نحوست زدہ چہرا! وہ گناہ کا استعارہ تھا ...... یہ شخص اسے ایک جیل میں ملا تھا۔ اس نے سات قتل کئے تھے اور اسی جرم میں چند روز بعد ہی اسے پھانسی لگنے والی تھی۔ جہنم اس کی آنکھوں میں رقص کرتی تھی۔ اس کا چہرہ مکروہ ترین تاثر سے بھرا ہوا تھا۔ مصور نے حکام کی اجازت سے اس کی تصویر بنانا شروع کی۔ تصویر کی تکمیل کے بعد وہ اپنے پہلے شاہکار کو نئے فن پارے کے برابر میں رکھ کر تقابل کرنے لگا۔ فن کارانہ نکتہ نظر سے یہ فیصلہ کرنا دشوار تھا کہ دونوں تصویروں میں سے کون سی اعلیٰ ہے۔ دونوں ہی معجزنما تھیں۔ وہ دونوں کو تکتا ہی رہ گیا۔

اسی عالم حیرزدگی میں اس نے ایک سسکی سنی۔ وہ آواز کی طرف مڑا تو اس نے عجب منظر سامنے پایا۔ زنجیر بستہ قیدی بری طرح رو رہا تھا۔ فنکار تو بوکھلا کے رہ گیا۔ اس نے دریافت کیا: "میرے دوست! تم کیوں رو رہے ہو؟ ان تصویروں نے تمہیں کیوں اس قدر پریشان کر دیا؟"

قیدی نے سسکیاں بھرتے ہوئے جواب دیا: میں نے گزشتہ دنوں میں آپ سے یہ حقیقت پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی لیکن آج میری ہمت جواب دے گئی ہے۔ میرے

اعصاب بری طرح ٹوٹ پھوٹ چکے ہیں۔ شاید آپ جان نہیں سکے کہ پہلی تصویر بھی میری ہی ہے۔ میں ہی وہ چرواہا ہوں جسے آپ بیس سال قبل ملے تھے اور اپنے اولین الوہیت نما مجسم خیر شاہکار کی تخلیق کے لئے ماڈل چنا تھا۔ میں اپنے زوال پر رو رہا ہوں۔ آہ میں جنت سے جہنم میں جاگرا! افسوس میں خدا سے شیطان کو مراجعت کر گیا!

میں نہیں جانتا کہ یہ کہانی کس قدر حقیقی ہے۔ لیکن ایک بات یقینی ہے کہ انسان کی زندگی کے دو قطعی متضاد رخ ہوتے ہیں۔ ہر انسان میں خدا اور شیطان دونوں موجود ہوتے ہیں۔ ہر انسان میں دوزخ اور جنت امکانی طور پر موجود ہوتی ہے۔ انسان میں گلابوں کی خوش نظر باڑی بھی کھل سکتی ہے۔ انسان ہی میں کیچڑ کا ڈھیر بھی لگ سکتا ہے۔ ہر انسان ان دو انتہاؤں کے مابین جھول رہا ہے۔ انسان ہر دو انتہاؤں پر پہنچ سکتا ہے۔ اکثر لوگوں میں جہنم کی طرف جھکاؤ ہوتا ہے۔ روحانیت کے متمنی بہت ہی کم ہوتے ہیں' جو اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرتے ہیں۔ کیا ہم اپنی زندگی کو خدا کا ایک معبد بنانے میں کامیاب ہو سکتے ہیں؟ کیا ہم اس تصویر جیسے ہو سکتے ہیں جس سے خدا کا انعکاس ہو؟

یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟ اس سوال کے ساتھ ہی میں اس بحث کو از سر نو شروع کرتا ہوں۔ انسان کیونکر خدا کا عکس جلی بن سکتا ہے؟ کیا انسان کی زندگی کا ایک جنت ---- ایک خوشبو' ایک خوب صورتی' ایک ہم آہنگی میں ڈھل جانا ممکن ہے؟ کیا انسان کے لئے یہ جاننا ممکن ہے کہ بقائے دوام کیا ہے؟ انسان کے لئے خدا کے معبد میں داخل ہونا کیونکر ممکن ہے؟ اس تناظر میں زندگی کے حقائق مخالف سمت میں پیش رفت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ عہد طفلی میں ہم جنت میں ہوتے ہیں لیکن جیسے ہی ہم بڑے ہوتے ہیں ہم رفتہ رفتہ جہنم میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔ عہد طفلی مکمل طور پر معصومیت اور خالص پن کا زمانہ ہوتا ہے۔ بعد ازاں دھیرے دھیرے ہم جھوٹ اور فریب سے اٹی ہوئی شاہراہ پر گامزن ہو جاتے ہیں' وقت گزرتا رہتا ہے اور ہم بوڑھے

ہوجاتے ہیں ـــــــ نہ صرف ہم جسمانی طور پر بوڑھے ہوتے ہیں بلکہ ہماری روحیں بھی بوڑھی ہوجاتی ہیں' نہ صرف ہمارا جسم ہی کمزور اور لاغر ہوجاتا ہے بلکہ روح بھی بربادی کی سطح پر جا پہنچتی ہے۔ ہم اس تبدیلی کو محض یونہی سا تصور کرتے ہیں اور اس طرح اپنے آپ کو ہی ضائع کر بیٹھتے ہیں۔ اس زوال کے متعلق' جنت سے جہنم کو اس سفر کی بابت مذہب تقدیر پرست ہوتا ہے۔ تاہم یہ سفر اس کے برعکس بھی ہوسکتا ہے۔ مہم کو ثمرآور ہونا چاہیے' اس کا رخ الم سے مسرت کی طرف' تاریکی سے روشنی کی طرف' فنا سے بقا کی طرف ہونا چاہیے۔ آرزو فنا سے بقا کی طرف رسائی کی ہونی چاہیے۔ روح کی پیاس ہونی چاہیے۔ صرف روح کی تلاش ہی تاریکی سے روشنی تک رسائی پانے کے مترادف ہے۔ اس سلسلے میں اولین توانائی کی طلب ہی باطل سے حق کی طرف مراجعت ہے۔ لیکن فانی انسان کو توانائی بچانے اور قوت بڑھانے کی تدبیر کرنی چاہیے۔ حق کو پانے' ورائے ذات کے عرفان کے لئے انسان کو حدود نا آشنا قوت کا ذخیرہ بن جانا چاہیے۔ تب صرف محض وہی ابد آشنا ہوگا۔ جنت کمزوروں کے لئے قطعاً" نہیں ہے۔

زندگی کے حقائق میں ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہے جنہوں نے اپنی توانائی کو ضائع کردیا ہے اور کمزور و ناتواں ہو چکے ہیں۔ جنہوں نے زندگی کی توانائی کو ضائع کر دیا ہے' جو بانجھ اور بنجر ہو چکے ہیں' وہ تلاش حق کی مہم میں شامل نہیں ہوسکتے۔ بلندیاں چھونے کے لئے توانائی کی ضرورت ہوتی ہے اور توانائی کا تحفظ مذہب کا اولین مطالبہ ہے۔ لیکن ہم تو ایک کمزور اور بیمار نسل ہیں۔ توانائی ضائع کرنے کی وجہ سے ہم مسلسل کمزور سے کمزور تر ہوتے جا رہے ہیں۔ حیاتیت رستی جارہی ہے اور اندر فقط محض کھوکھلا ہو چکا باقی رہ گیا ہے۔ ہولناک خالی پن کے سوا کچھ بھی تو نہیں بچا۔ سو یہ ہے ہماری زندگی ـــــــ اگر اسے زندگی کہا جا سکتا ہے! ہماری زندگی صرف و محض مسلسل خسارے کی درد بھری کہانی ہے۔ ہماری زندگی بارآور نہیں ہے۔

یہ سانحہ کیونکر ممکن ہوا؟ ہم توانائی کو کیونکر ضائع کرتے ہیں؟ انسان کی توانائی کا

سب سے بڑا ذریعہ نکاس جنس ہے۔ یہ جنس ہے' شہوت ہے جو مسلسل رس رہی ہے' اسے روکا جانا چاہیے۔ کوئی انسان مستقل خسارے کو پسند نہیں کرتا لیکن جیسا کہ میں پہلے بھی تمہیں بتا چکا ہوں کہ انسان ناقابل مزاحمت علت سے اپنی توانائی کو اتنا زیادہ ضائع کرتا ہے۔ جنس کی مسرت بخش جھلک کی وجہ سے خواہی نخواہی انسان اپنی توانائی کے ضیاع کی طرف بار بار کھنچا چلا جاتا ہے۔ درخشاں لیکن جلد ماند پڑ جانے والے جنس کے شگاف میں ایسی بے انتہا کشش ہوتی ہے کہ انسان اس کو ضائع کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے جو ہر شے کی بنیاد ہے۔ اگر یہی شدید مسرت وکیف کسی اور ذریعے سے حاصل ہونا ممکن ہوتی تو آدمی جنس کے ذریعے توانائی ضائع کرنا چھوڑ دیتا۔

کیا اس تجربے کے حصول کا کوئی متبادل بھی ہے؟ کیا ایسا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے جس سے ہم اسی سرافراز تجربے کا ادراک کر سکیں' جس میں ہم عمیق تر کو ماپ سکیں۔ بہ نسبت روح کے عمیق ترین نہاں خانوں کے ـــــ جب ہم وجود کی انتہائی بلندیوں کو چھوتے ہیں ـــــ جہاں ہم لطیف ناقابل بیان سعادت اور خالص مسرت کا جلوہ دیکھتے ہیں۔ ایک ایسا کشادگی عطا کرنے والا تجربہ جہاں تعینات و تحدیدات بالکل ختم ہو جاتی ہیں! کیا کہیں کوئی دوسرا راستہ ہے؟ کیا اپنے داخل میں موجود اس سکون آشنا خلیج میں غوطہ زن ہونے کا کوئی دوسرا راستہ کہیں ہے؟ کیا ہم سب موجود سکون و مسرت کے اس ابدی سرچشمے سے وصال کا کوئی دوسرا طریقہ ہے؟

اس کے جاننے سے قلب ماہیت ممکن ہے۔ تب شہوت سے عبودیت کی طرف سفر آغاز ہوگا اور انسان "کاما" سے "راما" کی طرف رخ پھیرلے گا ایک داخلی انقلاب رونما ہوگا' ایک نیا راستہ کھلے گا۔ اگر انسان کو نئی راہ نہ دکھائی گئی تو وہ ایک چکر میں مسلسل گھومتا رہے گا اور خود کو برباد کرے گا۔ انسان کا جنس کے بارے میں گمراہ کن تصور اسے کسی دوسرے بہتر ذریعہ نکاس کے متعلق سوچنے تک سے روکے ہوئے ہے۔ اس طرح زندگی میں انتشار انگیز بے ربطی پیدا ہوگئی ہے۔ فطرت نے انسان کو صرف ایک راستہ ودیعت کیا ہے اور وہ ہے جنس۔ لیکن "تعلیمات" نے ہزاروں برس سے اس "

باب نجات" کو مقفل کر رکھا ہے۔ ایک اطمینان بخش کشادگی کی عدم موجودگی میں ہمارے اندر موجود حیاتیت سرگرداں ہے اور انسان کی شخصیت پر دباو بڑھاتے ہوئے اور اس کو انتشار زدہ کرتے ہوئے اسے ایک نیوراتی (نفسیاتی مریض) بنائے دے رہی ہے۔

مزید یہ کہ انتشار زدہ انسان جنس۔ شہوت کا قدرتی راستہ استعمال نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کے اندر دباو اتنا شدید ہوتا ہے جو سارے دروازے کھڑکیاں توڑ کر چھلانگ مار کر باہر نکل آتا ہے چاہے اس کے نتیجے میں ٹانگیں بازو ہی کیوں نہ ٹوٹ جائیں۔ جنسی توانائی قدرتی بند راستے میں مقید ہونے کے باوصف اور اس وجہ سے کہ ماورائے فطرت راستہ ہنوز کھلا نہیں ہوتا' نکاس کے غیر فطری راستوں سے بہہ نکلی ہے۔ اس سانحے کا وقوع انسانیت کی سب سے بڑی بدقسمتی ہے۔ کوئی نیا راستہ کھلا نہیں ہے اور پرانا دروازہ پہلے ہی سے بند پڑا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں جنس سے دشمنی اور جبر پر مبنی روایتی تعلیمات کے خلاف سختی سے اٹھ کھڑا ہوا ہوں۔ قدیم تعلیمات کا کل حاصل وصول یہی کچھ ہے کہ انہوں نے نہ صرف انسان میں جنسیت کو پیدا کیا ہے بلکہ کجروی کو بھی جنم دیا ہے۔ آخر اس کا مداوا کیا ہے؟ کیا کہیں اس کا متبادل بھی ہے؟

اب ...... آؤ ہم ملاحظہ کرتے ہیں ...... جنس کے لمحوں میں ہونے والا کشف دو عناصر پر مشتمل ہوتا ہے: "بے انائی" اور "عدم وقتی"۔ وقت تھم جاتا ہے اور انا کافور ہو جاتی ہے۔ انا کی عدم موجودگی اور وقت کے ٹھہراو کے باوصف ہمیں اپنی ...... اپنی حقیقی انا ...... کی واضح بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ اس شکوہ کا لمس لمحاتی ہوتا ہے اور پھر ہم اپنی مبتذل روش کی پستی میں آپڑتے ہیں۔ لیکن اس اثنا میں ہم توانائی ...۔ ایک نوع کی برقی مقناطیسی توانائی ...... کی ایک قابل لحاظ مقدار گنوا بیٹھتے ہیں۔ ذہن اس کے نظارے کے لئے' اسے دوبارہ گرفت کرنے کے لئے مائل ہوتا لیکن یہ جلوہ' یہ الہام اتنا زودرفت ہوتا ہے کہ ہم بمشکل اسے دیکھ ہی پاتے ہیں کہ یہ غائب ہو

جاتا ہے۔ بس اس تجربے کے دوبارہ حصول کی ایک شدید خواہش' ایک خبط' ایک جنون خیز اضطراب ہی باقی رہ جاتا ہے۔ ساری عمر انسان اس جلوے کو' اس جذبات انگیز تجربے کو گرفت کرنے کے لئے بار بار کوشش کرتا ہے لیکن حاصل نہیں کر پاتا۔

ذات کے جوہر ...... شعور اعلیٰ تک رسائی کے دو ذرائع ہیں جنس اور مراقبہ۔ جنس وہ راستہ ہے جو قدرت نے بخشا ہے۔ یہ ایک فطری ذریعہ ہے۔ جانور بھی اس کے حامل ہوتے ہیں' پرندے بھی اس کے حامل ہوتے ہیں پودے بھی اس کے حامل ہوتے ہیں اور انسان بھی اس کا یکساں طور پر حامل ہوتا ہے۔ لیکن اگر انسان قدرت کے عطا کردہ اس راستے کو جانوروں سے اعلیٰ سطح پر تصور نہیں کرتا تو وہ عروج نہیں پا سکتا۔ یہ راستہ تو جانوروں تک کے لئے قابل حصول ہے جس دن انسان ایک نیا راستہ بنانے کا اہل ہوگیا' یہ اس میں انسانیت کی صبح کے طلوع کے مترادف ہوگا۔ اس سے قبل ہم انسان نہیں ہیں۔ اس سے قبل ہماری زندگی کا محور اور جانوروں کی زندگی کا محور مشترک ہے ...... جو فطری محور یعنی جنس ہے۔ جب تک ہم اس سے بالاتر نہیں ہوتے' ماورا نہیں ہوتے ہم جانوروں کی سطح پر ہی ہوتے ہیں۔ بظاہر تو ہم انسان ہوتے ہیں' ہم انسانوں کی طرح خود کو لباس سے ڈھانپتے ہیں' ہم انسانوں کی زبان بولتے ہیں لیکن داخلی طور پر' اپنی نہاد میں ہمارا محور جانوروں جیسا ہی ہوتا ہے۔ نہ ہی اس سے زیادہ ہم کچھ ہوسکتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے اندر موجود جانور ذرا سا بھی موقع دستیاب ہوتے ہی جاگ اٹھتا ہے۔

ہندوستان اور پاکستان کے قیام کے اعلان کے فوراً" بعد ہونے والے بلووں میں ہم انسان کے بھیس میں پوشیدہ درندے کی سفاکیوں کا مشاہدہ کر چکے ہیں۔ ہم ان سب لوگوں کی اصلیت سے آگاہ ہوئے جو مندروں میں گیتا پڑھتے اور عبادت خانوں میں عبادت کرتے ہیں' یہ سب موقع ملتے ہی درندگی کا مظاہرہ کرنے پر قادر ہیں۔ انہوں نے لوٹ مار کی' عفت مآب عورتوں کی عصمت دری کی اور کیا کچھ نہیں کیا۔ کل جن لوگوں کو مندروں اور عبادت گاہوں میں عبادت کرتے ہوئے دیکھا گیا تھا' آج انہیں

میں زنا جیسے شیطانی فعل کا ارتکاب کر رہے تھے۔ انھیں کیا ہو گیا تھا؟ فرائض سے روگردانی کا معمولی سا موقع پاتے ہی انسان اپنی انسانیت کو فراموش کر بیٹھا ہے اور اس کے اندر کا کھل کھیلنے کو ہمہ وقت آمادہ درندہ فی الفور جھپٹ پڑتا ہے۔

انسان اس درندے کو زنجیر کرنے' اس کو قابو رکھنے کے لئے ہمیشہ ایک کشمکش کا شکار رہتا ہے۔ افراتفری کی صورت حال میں وہ خود پر مسلط بہروپ اتار پھینکنے کا موقع حاصل کر لیتا ہے' اپنے آپ کو فراموش کرنے کے لئے۔ فساد میں وہ اپنی "انا" ---مصنوعی انا ...... کو فراموش کرنے کی جرات پیدا کر لیتا ہے۔ درندہ رہا ہو جاتا ہے۔ انسان نے ایک فرد کی حیثیت سے اتنے گناہوں کا ارتکاب نہیں کیا جتنے گناہ اس سے ہجوم میں سرزد ہوئے ہیں۔ اکیلا آدمی قدرے خوفزدہ ہوتا ہے کہ کوئی نہ کوئی اسے پہچان لے گا' اکیلا آدمی کچھ کر گزرنے سے قبل قدرے سوچتا ضرور ہے کہ وہ کیا کرنے کو ہے۔ وہ اس بات سے ڈرتا ہے کہ کہیں دوسرے لوگ اسے درندہ قرار نہ دے دیں۔ لیکن بڑے ہجوم میں وہ اپنی شناخت کھو بیٹھتا ہے۔ وہ پہچان لئے جانے سے قطعاً" نہیں ڈرتا' تب وہ ایک ہجوم کا جزو ہوتا ہے اور جو کچھ اردگرد موجود لوگ کر رہے ہوتے ہیں وہ بھی وہی کچھ کر گزرتا ہے۔ اور وہ کیا کرتا ہے؟ وہ پتھراؤ کرتا ہے' آتش زنی کرتا ہے' عصمت دری کا مرتکب ہوتا ہے۔ افراتفری کے عالم میں وہ اپنے اندر کے درندے کو آزاد چھوڑنے کے موقع سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ اور یہی سبب ہے کہ گزشتہ پانچ سے دس ہزار برس کے دوران میں انسان جنگ کے لئے بے قرار رہا ہے۔ وہ کسی فساد کے پھوٹ پڑنے کا منتظر رہتا ہے۔ اگر ایسا ہندو مسلم مسئلے کی وجہ سے ہے تو پھر ٹھیک ہے اگر ایسا نہیں ہے تو گجراتی مراٹھی مسئلہ اس مقصد کے لئے موزوں ہے۔ اگر گجراتی مراٹھی کسی فساد کے لئے تیار نہیں تو آدمی ہندی بولنے والے نہ بولنے والے کے درمیان خود کو مطمئن محسوس کر سکتا ہے۔ اس کو تو بس بہانہ چاہیے۔ مستقل پابندی نے درندے کو بدحواس کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ باہر نکلنے کے لئے چلاتا ہے جب تک درندے پر غلبہ نہیں پایا جاتا' اسے تباہ نہیں کیا جاتا انسان کا ضمیر حیوانیت

سے بالاتر نہیں ہو سکتا۔

ماہرین جنسیات کی تحقیق ہے کہ زندگی کے اندر سب سے طاقتور دو حسیں ہیں۔ ایک تحفظ ذات اور دوسری تحفظ نسل۔ زندگی نے تحفظ ذات کے لئے جو عضو ایجاد کیا وہ منہ تھا جبکہ تحفظ نسل کے لئے جنس ایجاد کی۔ توانائی کے حصول کا ذریعہ منہ ہے اور توانائی کے نکاس کا ذریعہ آلات تناسل ہیں۔ بقائے ذات کی جستجو میں خلئے فروغ ذات کے لئے ایک سے دو اور دو سے چار مائی ٹوسس کے عمل سے فروغ پانے کی حکمت عملی پر کام کرتے ہیں۔ جبکہ جنسی اعضا میں خلیوں کو ادھیڑا جاتا ہے۔ زندگی نے جنس کو موت کے عوض پایا ہے۔ جوں جوں توانائی کم ہوتی جاتی موت کا امکان بڑھتا جاتا ہے۔ موت اور جنس میں تعلق کا ایک اور ثبوت میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ مچھلیوں اور کیڑوں میں کئی انواع ایسی ہیں جن کے نر جنسی وظیفے کو سرانجام دیتے ہی بکھر کر موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔

رحم مادر جنین کی پرورش کے لئے ایک جنت کا درجہ رکھتا ہے۔ رحم مادر میں جب بچے کا دماغ تشکیل پانے لگتا ہے تو رحم مادر میں بچے کو ہر چیز خواہش کے مطابق بلاتردو حاصل ہوتی رہتی ہے۔ اس جنت میں اس پر من و سلویٰ اترتا رہتا ہے۔ رحم مادر کا سارا ماحول بچے کی خدمت پر مامور ہوتا ہے پھر جب بچہ مکمل ہو جاتا ہے تو رحم مادر میں ہی موجود سارے کے سارے خدمت گار عفریت بن کر بچے کو اس جنت سے باہر نکالنے کی کوششوں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ دردزہ کے جھٹکے بچے کو بھی محسوس ہوتے ہیں۔ رحم مادر سے قطع تعلق کے وقت بچے کے گردوپیش کا ماحول طوفان نوح کا سا سماں پیدا کر دیتا ہے۔ رحم کے سارے عناصر بچے کو جنت سے زورازوری باہر دھکیل دیتے ہیں۔ اپنی جنت کے انقطاع اور راہ گزر کی تکلیفوں کے باعث بچہ روتے ہوئے دنیا میں آنکھ کھولتا ہے۔ یہ تمام تجربات بچے کے تحت الشعور میں مرتسم ہو جاتے ہیں جن کو وہ منطقی رنگ میں بیان نہیں کر سکتا لیکن اپنے محسوسات سے انھیں خارج بھی نہیں کر سکتا۔ تحت الشعوری حافظے کا یہی مقام مذہب کی آماجگاہ ہے۔

ایک اور اہم ترین حقیقت یہ ہے کہ انسانی وجود نباتات' حیوانات اور انسان کا مجموعہ ہے۔ اس میں نباتاتی خصوصیات ابھی تک موجود ہیں۔ اس کے بال نباتات کی طرح بڑھتے ہیں۔ اس کے ناخن نباتات کی طرح اگتے ہیں۔ اس کی کھال زخمی ہو جائے تو دوبارہ پھوٹ پڑتی ہے۔ روشنی کے لئے وہ نباتات ہی کی طرح بیتاب ہوتا ہے۔ اس طرح حیوانی ارتقا کے تمام مراحل اس کے ڈھانچے میں محفوظ ہیں۔ اس کے دماغ کی تہوں میں حیوانی دماغوں کے سارے خاکے موجود ہیں۔ اور ان کو جو قوت کنٹرول کرتی ہے وہ جنس ہے' شہوت ہے۔ جتنا تم اس توانائی کو ضائع کرتے ہو حیوانی یہاں تک کہ نباتاتی اوراوصاف ابھرتے ہیں اور انسان ہونے کی حالت ماند پڑتی جاتی ہے۔

ہماری حیوانیت' قوت حیات' توانائیاں صرف ایک آسان ذریعہ نکاس رکھتی ہیں اور وہ ذریعہ نکاس جنس ہے۔ اس راستے کی بندش سے مسائل جنم لیں گے۔ اس راستے کی بندش سے قبل یہ ضروری ہے کہ ایک نیا دروازہ کھولا جائے تاکہ توانائیاں ایک نئی سمت میں مڑ جائیں۔ یہ ممکن تو ہے لیکن اس پر عمل درآمد نہیں کیا جاتا۔ جس کی وجہ بڑی سادہ ہے اور وہ یہ کہ جبر قلب ماہیت سے زیادہ آسان ہے۔ کسی چیز سے معاملہ کرنے اور اس کی قلب ماہیت کی بجائے اس کو پوشیدہ کرنا آسان ہے۔ کیونکہ آخرالذکر عمل کی مشقوں اور سادھنا ..... مراقباتی عمل کے مسلسل ذریعے ..... کی محتاج ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم جنس کے داخلی جبر کو اختیار کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم نہیں جانتے کہ جبر سے کچھ ختم نہیں ہو سکتا' اس کے برعکس اس کو ردعمل سے تقویت حاصل ہوتی ہے۔ ہم یہ بھی بھلا دیتے ہیں کہ جبر کسی چیز کی کشش میں شدت پیدا کرتا ہے۔ جس شے کو ہم دباتے ہیں وہ ہمارے شعور کا مرکز بن جاتی ہے اور ہمارے تحت الشعور کی گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہے۔ ہم بیداری کے عالم میں تو اس کو دبا دیتے ہیں لیکن رات میں یہ ہمارے خوابوں میں کوند جاتی ہے۔ اندر یہ بے تابی سے انتظار کرتی ہے کسی ہیجان خیز موقع کا۔ جبر کسی چیز سے آزادی دلانے کے لئے ناکافی ہے۔اس کے برعکس اس کی جڑیں تحت الشعور میں گہری اتر جاتی ہیں اور ہمیں پھانس لیتی ہیں۔

جانور محدود طور پر اور وقفوں سے جنسی فعل سرانجام دیتے ہیں۔ لیکن انسان کوئی وقفہ اور کوئی حد اس معاملے میں خاطر میں نہیں لاتا۔انسان سال کے ہر پل جنسی رہتا ہے۔ جانوروں کی دنیا میں کوئی ایک جانور بھی اس نوع کا جنسی نہیں ہے۔ ان میں اس کا ایک مخصوص وقت' عرصہ ..... موسم ہوتا ہے۔ یہ موسم آتا ہے اور گزر جاتا ہے' اس کے بعد جانور اس کے متعلق دوبارہ کبھی سوچتا بھی نہیں ...... لیکن' ذرا دیکھو تو سہی' انسان کے ساتھ کیا ہوتا ہے وہ شے جسے انسان دبانے اور کچلنے کی سعی کرتا ہے وہ زندگی بھر فعال رہتی ہے۔ کیا تم نے کبھی مشاہدہ کیا ہے کہ جانور ہر حالت میں اور ہر وقت جنسی نہیں ہوتے جبکہ انسان ہر جگہ اور ہر وقت جنس کی طرف مائل رہتا ہے۔ جنسیت اس کے داخل میں کھولتی رہتی ہے گویا جنسیت ہی زندگی میں سب کچھ ہے۔ آخر یہ کج روی کس طرح بروئے عمل آتی ہے؟ تباہی کس طرح وقوع پذیر ہوتی ہے؟ اس کی صرف ایک وجہ ہے اور وہ یہ کہ انسان نے جنس کو' شہوت کو دبانے کی انتہائی کوشش کی ہے اور اسی تناسب سے یہ پوری انسانی شخصیت میں پھوٹ پڑی ہے۔ اور ذرا سوچو تو سہی کہ ہم نے اس کو دبانے کے لئے کیا کچھ کیا ہے؟ ہمیں ایک ذلت آفریں طرز عمل وضع کرنا پڑا تھا۔ ہم جنس کی تحقیر کرتے' اس کو گالی دیتے ہیں۔ ہم چیختے ہیں کہ جنس گناہ ہے۔ ہم نے اعلان کر دیا ہے کہ جو لوگ جنس میں ملوث ہیں ان سے نفرت کی جانی چاہیے اور یہ کہ وہ قابل مذمت ہیں۔ ہم نے جبر کو تحسینی صورت دینے کے لئے اس پر خوش نما غلاف چڑھا دیتے ہیں۔ اس پر ستم یہ کہ ہمیں ادراک نہیں ہے کہ یہ گالیاں اور اعتراضات ہمارے پورے وجود کو مسموم کر دیں گے۔

نطشے نے ایک بڑا معنی آفریں جملہ کہا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگرچہ مذہب نے جنس کو مسموم کر کے اسے قتل کرنے کی کوشش کی ہے لیکن جنس قتل نہیں ہوئی ہے اور پوری طرح مسموم ہو کر بھی ابھی زندہ ہے۔ بہتر تو یہی تھا کہ یہ مر جاتی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ یہ مسموم ہے تاہم ابھی زندہ ہے ..... نشانہ چوک گیا ہے۔ یہ جنس پرستی جو ہم مشاہدہ کرتے ہیں' مسموم جنس ہی کا حتمی نتیجہ ہے۔ جنس شہوت جانوروں میں بھی

موجود ہے کیونکہ جنس ہی تو زندگی کا سرچشمہ ہے لیکن جنسیت جانوروں میں نہیں ہوتی بلکہ صرف اور صرف انسان میں پائی جاتی ہے۔ کسی جانور کی آنکھوں میں ڈھونڈو۔ تمہیں ان میں شہوت جنس نہیں ملے گی۔ لیکن اگر تم انسان کی آنکھوں میں تلاش کرو تو تمہیں ان میں جنس کی غلیظ شہوت کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ اور چنانچہ آج ایک لحاظ سے جانور خوب صورت ہیں جبکہ "جبر کرنے والے" کی بدہیتی اور عفونت کی کوئی حد ہی نہیں ہے۔

لہٰذا' جنسیت سے انسان کو آزادی دلانے کے لئے پہلے قدم کے طور پر جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے' لڑکیوں اور لڑکوں کو جنس کے موضوع پر تعلیم دینی چاہیے۔ علم میں اضافے ہی سے ان کے درمیان بدہیئت اور غیرفطری فاصلہ کم کیا جا سکتا ہے۔ امرواقعہ یہ ہے کہ انہیں ایک دوسرے کے نزدیک تر لایا جانا چاہیے۔ ان کی ایک دوسرے سے علیحدگی غیرفطری ہے۔ آدمی اور عورت ایک ہو کر مختلف انواع میں ڈھل چکے ہیں۔ اس بظاہر علیحدگی کو دیکھتے ہوئے انسان نے خانے بنا ڈالے یہاں تک کہ اب یہ طے کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ وہ ایک ہی نوع سے یعنی نوع انسان سے متعلق ہیں۔ اگر لڑکوں اور لڑکیوں کو گھروں میں عریاں رہنے اور مرضی کے مطابق کرنے دیا جائے تو بڑے ہونے پر ان کے ذہنوں میں ابھرنے والے فحش اور غیرفطری تجسس کا ابتدا ہی میں خاتمہ ہو جائے گا۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک دوسرے کے جسم کے متعلق یہ لاعلمی کس طرح سے بچوں کے احمقانہ تجسس میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی مثال میں یہ امر دیکھئے کہ مہذب انسانوں کے سب بچے "ڈاکٹر ڈاکٹر" کھیلنے میں کتنی دلچسپی ظاہر کرتے ہیں۔

مزید تم حیران ہو گے اگر تم امریکی معاشرے کے ایک طبقے کی طرف سے شروع کی گئی نئی تحریک سے آگاہ ہو۔ جس میں شامل سب کے سب لوگ مذہبی ہیں۔ اس تحریک کا نصب العین یہ ہے کہ گائیوں' بھینسوں' کتوں' بلیوں' گھوڑوں اور دوسرے جانوروں کو سڑکوں پر "بے پردہ" آنے سے روکا جائے۔ انھیں سڑکوں پر لائے جانے سے پہلے "لباس" پہنایا جانا چاہیے۔

لباس" پہنایا جانا چاہیے۔ اس میں جو حکمت مضمر ہے وہ یہ ہے کہ بچے "عریاں" جانوروں کو دیکھ کر "خراب" ہو سکتے ہیں۔ یہ خیال کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ کوئی بچہ کسی "عریاں" جانور کو دیکھ کر "خراب" ہو سکتا ہے! اس تحریک کے چلانے والے ایک ادارہ بھی بنا رہے ہیں "عریاں" جانوروں کو سڑکوں پر لانے سے روکا کرے گا۔

دیکھو! انسان کے تحفظ کے لئے کیا کچھ کیا جا رہا ہے! یہ تحفظ کنندگان وہ ہیں جنھوں نے درحقیقت انسان کو تباہ کر دیا ہے۔ کیا تم نے کبھی غور کیا ہے کہ جانور چاہے وہ "بے پردہ" ہی کیوں نہ ہوں' کس قدر حیران کن اور خوبصورت لگتے ہیں۔ اپنی "عریانی" کے باوصف وہ معصوم اور بھولے بھالے لگتے ہیں ایسا شاذونادر ہی ہوا ہو گا کہ تم نے کبھی کسی جانور کی "عریانیت" کے متعلق سوچا ہو۔ تم اس وقت تک کسی جانور کی "عریانی" کا سوچ بھی نہیں سکتے جبکہ خود تمہارے اندر اس سے کہیں زیادہ "عریانی" نہاں نہ ہو۔ مگر وہ لوگ جو خوفزدہ اور بزدل ہیں عریانیت سے اپنی خوفزدگی کی وجہ سے یہ سب کچھ کرنے کے لئے کوشاں ہیں۔ انسان اس طرح کے "اکسیر" ایجاد کرنے کے باعث دن بدن ٹوٹتا پھوٹتا اور ذلت کی پستیوں میں گرتا چلا جا رہا ہے۔ انسان کو اس قدر سادہ ہو جانا چاہیے کہ اسے عریاں اور بغیر کوئی لباس پہنے۔ معصوم اور خوشی سے معمور رہنا چاہیے۔ مہاویر جیسا کوئی شخص بے لباس ہو کر رہنے والوں کا نمائندہ ہے۔ اسی طرح ہر شخص کو بے لباس جینے کی ذہنیت پیدا کرنی چاہیے۔ مذہبی لوگ کہتے ہیں کہ مہاویر نے لباس کو بے کار جان کر اتار پھینکا تھا' کپڑوں کو ترک کر دیا تھا لیکن میں اس کی تردید کرتا ہوں۔ اس کا چترا یعنی ضمیر ایک بچے کی طرح بہت صاف' بہت معصوم اور بہت ہی خالص تھا اور جس انسان کے پاس چھپانے کے لئے کچھ رہا ہی نہ ہو تو وہ عریاں ہو سکتا ہے' وہ عریاں ہو کر دنیا کا سامنا کرنے کو نکل سکتا ہے۔

انسان اس لئے خود کو چھپاتا ہے کہ اس کے اندر "کسی شے" کو پوشیدہ کرنے کا احساس موجود ہوتا ہے۔ لیکن جب چھپانے کو کوئی شے ہی نہ ہو تو کوئی شخص بے لباس بھی رہ سکتا ہے۔ ضرورت ایک ایسی سرزمین کی ہے جہاں ہر فرد اس قدر منزہ عن

الغرض' صاف ذہن اور متین ہو کر وہ لباس کو بے کار سمجھ کر ترک کر دے۔ جرم کہاں ہوتا ہے؟ عریاں ہونے میں کیا خطرہ نہاں ہے؟ یہ ایک الگ معاملہ ہے اگر لباس دوسری وجوہات سے پہنا جاتا ہے تو ٹھیک ہے لیکن اگر محض عریانی کے خوف سے پہنا جاتا ہے تو یہ بڑی تحقیر کی بات ہے۔ لباس کا عریانی کی دہشت کی وجہ سے پہنا جانا ایک "نسبتاً" بڑی عریانی کی نشاندہی کرتا ہے۔ یہ ایک آلودہ ذہن کا ثبوت ہے۔ لیکن آج لباس پہننے کے باوجود ثابت قدمی کے اہل محسوس نہیں کرتے تو اس کا مطلب ہے کہ ہم اندر موجود عریانیت کی آلودگی کو صاف نہیں کر سکے۔ تہذیب' تاریخ۔ کلچر کا بانی انسان کپڑوں کے اندر بھی ننگا رہتا ہے۔

آہ! خدا بھی کیا بچوں جیسا ہے! اس نے انسان کو بالباس پیدا کرنا تھا! ویسے براہ مہربانی اس سے یہ نتیجہ مت نکالنا کہ میں لباس پہننے کے خلاف ہوں۔ میں صرف یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ عریانی کے خوف سے لباس پہننے سے عریانیت نہاں نہیں ہوتی بلکہ اور عیاں ہوتی ہے۔ عریانیت کی جان کاری قابل نفرت' غیر فطری اور اخلاقی پستی ہے۔ اور یہ جانکاری طویل سماجی روایتوں کا فیصلہ ہے۔ ایک شخص لباس کے باوجود عریاں ہو سکتا ہے اور ایک عریاں شخص بالباس ہو سکتا ہے۔ عورتوں مردوں کے سکن ٹائٹ ملبوسات دیکھنے کے باوجود کیا یہ ضروری ہے کہ اس نکتے کی مزید وضاحت کی جائے؟ یہ تخیل کا چہرے مہرے کو دیکھنے اور دکھانے میں غیر مطمئن ہونے کا نتیجہ ہے۔ اگر آدمی اور عورتیں ایک دوسرے کے جسموں سے خوب شناسا ہوں تو لباس سوائے جسم کے تحفظ کے اور کوئی مقصد پورا نہیں کریں گے۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ آج کل لباس جنسیت کو انگیخت کرنے کے لئے ڈیزائن کئے جاتے ہیں جب لباس لباس نہ رہ گیا ہو بلکہ جنس پرستی میں معاون ہو تو تہذیب انسانی کی منزل کہاں ہو سکتی ہے؟ لہٰذا میں بچوں کو ایک مخصوص عمر تک عریاں رکھنے کی وکالت کرتا ہوں۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ کپڑوں کی ضرورت کسی اور ہی وجہ سے ہے' عریانی لباس کی وجہ نہیں ہے۔

مزید یہ کہ عریانی کا تصور دراصل ایک داخلی رجحان ہے۔ ایک سادہ ذہن کے لئے' ایک معصوم ذہن کے لئے' عریانی ناقابل اعتراض ہے' بلکہ ایک خوب صورتی رکھتی ہے لیکن آج تک انسان کو مسموم کیا گیا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ رفتہ رفتہ یہ زہر زندگی کے ایک سے دوسرے سرے تک پھیل گیا ہے۔ نتیجے کے طور پر ہمارے رجحانات غیر فطری ہو گئے ہیں۔ ہمہ جہت جبر نے مزید پیچیدگیوں کو جنم دیا ہے۔

ایک دفعہ جب میں نے بھارتیہ ودیا بھون آڈیٹوریم بمبئی میں اس موضوع پر بات کی تو ایک خاتون آئیں اور مجھ سے کہنے لگیں: "میں آپ پر سخت ناراض ہوں۔ جنس ایک بدنام زمانہ موضوع ہے۔ جنس تو گناہ ہے۔ آپ نے اس موضوع پر اتنی تفصیل سے کھل کر گفتگو کیوں کی؟ میں جنس سے نفرت کرتی ہوں"۔

اب تم خود بتاؤ' وہ خاتون جنس سے نفرت کرتی ہے حالانکہ وہ ایک بیوی ہے' اس کا ایک خاوند ہے اور اس کے بیٹے بیٹیاں بھی ہیں۔ وہ کیونکر اپنے خاوند سے محبت کر سکتی ہے جو اسے جنس میں دھکیلتا ہے یا وہ کیسے اپنے بچوں سے محبت کر سکتی ہے جو جنس کے عمل سے پیدا ہوتے ہیں؟ اس کا زندگی میں ایسا طرز عمل مسموم طرز عمل ہے۔ اس کی محبت بھی مسموم رہے گی۔ اور شوہر اور بیوی کے درمیان بنیادی طور پر ایک گہری خلیج موجود رہے گی۔ ایک خاردار پردہ بچوں اور ماں کے درمیان کھڑا ہو گا کیونکہ بچے جنس ہی کا تو ثمر ہیں۔ اس کے اور اس کے خاوند کے درمیان رشتہ گناہ اساس ہے۔ جس سے شعور میں "خطا کا الجھاؤ" (گلٹ کمپلیکس) پیدا ہوا ہے اور کیا ہم اس سے دوستی رکھ سکتے ہیں جس سے گناہ کا رشتہ ہو؟ کیا ہم گناہ سے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں؟

جو لوگ جنس کو بدنام کرتے پھرتے ہیں انھوں نے ہر شخص کی ازدواجی زندگی میں خلل اندازی کی ہے۔ نجات کے باوجود اس خلل زدگی کے رجحان نے انسان پر برے اثرات مرتب کئے ہیں۔ وہ شخص جو اپنے اور اپنی بیوی کے درمیان غیر مرئی حد بندی کا تجربہ کرتا ہو اپنی بیوی سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ وہ طوائفوں کے ہاں جانے لگے گا۔ اگر

اسے گھر میں کامل تسکین حاصل ہو تو ساری دنیا کی عورتیں اسے ماں اور بہن لگیں گی۔ ایسا نہ ہو تو ہر عورت میں اسے بیوی نظر آئے گی جس سے وہ مباشرت کی خواہش کرے گا۔ ایسا ہونا بالکل فطری ہے' ایسا ہونا ہی تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے جہاں سعادت' مسرت اور سکون ورثے میں ملنا چاہیے تھا وہاں اس نے زہر' گناہ اور کراہت پائی ہے۔ اس کی بنیادی ضرورتیں پوری نہیں ہوئیں اور وہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے جگہ جگہ بھٹک رہا ہے۔ اگر ہم ان تمام آلات (ذرائع) کی فہرست بنائیں جو اس نے اختراع کئے ہیں تو ہم دنگ رہ جائیں گے۔

انسان نے چال چلنے میں لغزش کی ہے۔ لیکن اس نے اس بنیادی ناکامی پر غور نہیں کیا۔ جو محبت کی تجیل تھی' جو جنس کا تالاب تھا اسے مسموم کر دیا گیا ہے اور جب خاوند اور بیوی کے مابین گناہ کا ایک پختہ شعور' زہر کا اثر' ہچکچاہٹ موجود ہو تو پھر یہ خطاکارانہ اپروچ زندگی کے ترفع کو معطل کر کے رکھ دے گی۔ ورنہ جہاں تک میں سمجھا ہوں اگر خاوند اور بیوی جنس کو خالص خوشی کے شعور کے ساتھ' بنا کسی اداسی کے قبول کرنے کی مشترکہ کوشش کریں تو اگر آج نہیں تو کل ان کے تعلق کی قلب ماہیت ہو گی' اس میں ترفع رونما ہو گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آگے چل کر وہی بیوی ایک ماں کے روپ میں رونما ہو۔

میں نے سنا ہے کہ ایک دفعہ گاندھی جی اور ان کی پارٹی کے ہمراہ کستربا گاندھی بھی سیلون گئیں۔ اناؤنسر نے استقبالیہ تقریر میں کہا: "ان کی خوش نصیبی ہے کہ گاندھی جی کی والدہ نے یہاں قدم رنجہ فرمایا ہے' جو اس وقت ان کے ساتھ ہی تشریف فرما ہیں۔" گاندھی جی کا سیکرٹری سخت حیران ہوا۔ یہ اس کی غلطی تھی' اسے چاہیے تھا کہ منتظمین سے تمام ارکان وفد کا پیشگی تعارف کروا دیتا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا گاندھی جی اس دوران میں مائیک پر پہنچ چکے تھے۔ سیکرٹری گاندھی جی سے پڑنے والی ممکنہ ڈانٹ ڈپٹ کے خیال سے ڈر سا گیا تھا۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ گاندھی جی اپنی بیوی کو ماں قرار دیئے جانے پر قطعاً" ناراض نہیں ہوئے تھے۔

گاندھی جی تو فرما رہے تھے: "یہ میرے لئے خوشی کی بات ہے کہ جس دوست نے میرا تعارف کروایا ہے وہ اپنی غلطی کے ذریعے سچ بیان کر گئے ہیں۔ گذشتہ چند برسوں سے کستربا میری ماں بن چکی ہیں۔ کبھی وہ میری بیوی ہوا کرتی تھیں لیکن اب وہ میری ماں ہیں۔"

یہ ہمیشہ مواقق ہوتا ہے اگر ایک آدمی اور ایک بیوی جنسی تعلق پر غور و فکر کرنے کی کوششیں کرتے ہیں۔ وہ دوست بن سکتے ہیں اور جنس --- شہوت کی قلب ماہیت میں ایک دوسرے کے معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ جونہی کوئی میاں بیوی جنس کی قلب ماہیت میں کامیاب ہو جائیں گے ان میں بے پناہ احساس تشکر پیدا ہو گا۔ لیکن فی الحال ان دونوں میں پیدائشی طور پر جنس کے لئے معاندت پائی جاتی ہے۔ ان میں ایک اٹل کشیدگی پائی جاتی ہے نہ کہ ایک باوقار دوستی۔ جب وہ ایک دوسرے کی جنسی خواہشات کی قلب ماہیت کا وسیلہ بنیں گے تو گہرا احساس تشکر پیدا ہو گا۔ جب وہ جنسی اختلاط سے بالاتر اور ماورا ہونے میں ایک دوسرے کے شریک بنیں گے تو ایک سچی دوستی کے گلاب کھلیں گے۔ اس روز آدمی عورت کے لئے سراپا احترام ہو گا کیونکہ اس نے جنس --- شہوت سے نجات پانے میں اس کی معاونت کی ہو گی۔ اور اس روز عورت کے لئے ممنونیت سے معمور ہو گی کہ آدمی نے جذبہ شہوت سے آزاد ہونے میں اس سے ارتباط کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور اسی دن سے وہ شہوت کی بجائے محبت کی سچی ہم آہنگی میں رہنے لگیں گے۔ یہ "نیا جنم" اس سفر کا نقطہ آغاز ثابت ہو گا جہاں خاوند بیوی کے لئے خدا اور بیوی خاوند کے لئے دیوی بن جاتی ہے۔

لیکن اس امکان کو مسموم کر دیا گیا ہے۔ میں نے پہلے تمہیں بتایا ہے کہ جنس کا مجھ سے بڑا دشمن تلاش کرنا دشوار ہے۔ مگر اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ مجھے جنس کی ملامت کرنی چاہیے۔ میں نے درست انداز میں ماورا ہونے کے لئے رہنمائی کے ادراک کے ساتھ کہا ہے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ شہوت کی قلب ماہیت کیسے ہو سکتی ہے۔ میں ان معنوں میں جنس کا دشمن ہوں کہ میں کوئلے کی ہیرے میں قلب ماہیت کا

حامی ہوں۔ میں جنس کی قلب ماہیت کا خواہش مند ہوں۔ میں اس بارے میں سوچتا ہوں کہ جنس کی قلب ماہیت کس طرح ہو سکتی ہے؟ اس کا طریقہ کار کیا ہے؟ میں نے سوچا کہ ایک نیا دروازہ ضرور کھلنا چاہیے۔ جنس بچے کے پیدا ہوتے ہی اس میں سرایت نہیں کر جاتی تاہم اس کا وقت ہے۔ جسم توانائی مجتمع کرے گا' خلیے طاقت حاصل کریں گے' جسم کی مکمل نشوونما میں وقت لگے گا۔ توانائی اکٹھی ہو گی اور پھر دروازے کو دھکیل کر کھول دے گی جو چودہ سال سے بند تھا اور یہ جنس کی دنیا سے تعارف ہو گا۔ جو دروازہ ایک دفعہ کھل جائے اس کے بعد کوئی نیا دروازہ حیاتیت کی قوت کی فطرت کے مطابق کھولنا مشکل ہوتا ہے' کہ ساری حیاتیت۔۔۔ مکمل توانائی۔۔۔ جس سمت بہہ نکلتی ہے اسی سمت میں رواں رہتی ہے۔ جب گنگا ایک بار اپنی سمت متعین کر لیتی ہے تو اسی سمت میں بہنا جاری رکھتی ہے۔ یہ روز روز نئے راستے تلاش نہیں کرتی۔ البتہ ہر روز نیا پانی ضرور آتا ہے اور پرانی ہی گزرگاہ میں بہتا چلا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح قوت حیات ایک گزرگاہ بناتی ہے اور پھر اسی گزرگاہ کو برقرار رکھتی ہے۔ اگر زندگی کو جنسیت کے مرض سے صحت یاب کرنا ہے تو یہ بہت ضروری ہے کہ جنس کا دروازہ کھلنے سے پیشتر ایک آغاز تو کیا جائے۔ یہ آغاز تو مراقبہ ہے۔

ہر نوعمر بچے کو مراقبے کی تعلیم اور عملی تربیت دی جانی چاہیے۔ جنس کے خلاف تعلیمات کو ختم ہونا چاہیے تعلیمات صرف اور محض مراقبے کے بارے ہونی چاہیے۔ یہ ہے ایک مثبت شروعات' ایک اعلیٰ آغاز۔ قوت حیات کو جنس اور مراقبے کے مابین فیصلہ کرنا ہے اور مراقبہ' میری رائے میں' جنس کا اعلیٰ ترین متبادل ہے۔

جنس کی ملامت نہ کرو بلکہ مراقبے کی تعلیم و تربیت کے ذریعے جنس اور مراقبے میں سے بہتر کا فرق واضح کرو۔ جنسی تعلیمات کی نفی کی باتیں تو عمر لڑکوں اور لڑکیوں کو جنس کے وجود کے بارے میں متجسس کریں گی۔ یہ انتہائی خطرناک امر ہو گا۔ یہ بعدازاں ناپختہ جنس کو کج روی کی طرف لے جائے گی۔ جب تک دروازے نہیں کھلتے توانائی محفوظ ہے۔ ابھی کوئی سا بھی دروازہ کھولا جا سکتا لیکن جنس مخالف نظریات کی

مسلسل تکرار جنس کے دروازے کو دھڑ دھڑا کر رکھ دے گی۔ ایک نرم اور لچک دار پودے کو کسی بھی سمت جھکایا جا سکتا ہے۔ یہ خود بھی عاجزی سے جھک جائے گا۔ جب یہ بڑا ہوتا ہے تب سخت ہو جاتا ہے۔ تب اگر تم اسے جھکانے کی کوشش کرو گے تو یہ ٹوٹ جائے گا۔ اسی طرح جنس کے معاملے میں ممکن ہے۔ پختہ عمر میں مراقبہ کے مقام تک رسائی بہت دشوار ہے۔ بڑی عمر کے لوگوں کو مراقبہ کے طریقے سکھانا ایسا ہی ہے جیسے موسم گزرنے کے بعد بیج بونا۔ مراقبے کا بیج نوجوانوں میں بویا جا سکتا ہے۔ لیکن انسان زندگی کے اختتام کے قریب پہنچ کر مراقبے میں دلچسپی ظاہر کرتا ہے جب توانائی ختم ہو چکتی ہے جب ترقی کے سب راستے دشوار ہو جاتے ہیں تو انسان مراقبے کی فکر کرتا ہے۔ تب وہ مراقبے اور یوگا کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتا پھرتا ہے۔ وہ اپنی اصلاح اس وقت چاہتا ہے جب سانچے میں ڈھل چکا ہوتا ہے' جب قلب ماہیت دشوار ہوتی ہے۔ جب انسان لب گور ہوتا ہے تب پوچھتا پھرتا ہے کہ مراقبے کے لئے کوئی ترکیب بتاؤ تاکہ نجات ممکن ہو سکے۔ یہ عجیب امر ہے۔ یہ مکمل پاگل پن کی نشاندہی کرتا ہے۔ ہمارا سیارہ اس وقت تک بے سکون ہی رہے گا جب تک ہم ہر نوجوان ذہن میں مراقبے کے نقش پختہ نہیں کرتے۔ جن کی زندگی کی شام ہو رہی ہے' جن کی بساط سے باہر ہے' انھیں مراقبے کے بارے میں سکھانے کی کوشش عبث ہے۔ اگر ایسا کرنے کی کوشش کی بھی جاتی ہے تو اس میں بہت زیادہ محنت لگے گی اور نتیجہ پھر بھی بہتر نہیں نکلے گا۔ کم عمری میں اس مقصد کا حصول آسان تر ہے اور تب اس کے لئے زیادہ جدوجہد بھی نہیں کرنا پڑے گی۔

چنانچہ جنس کی قلب ماہیت کی طرف پہلا قدم یہ ہے کہ ننھے بچوں کو مراقبہ کروایا جائے۔ انھیں پرسکون رہنے کی تربیت دی جائے۔ انھیں کم سخنی کی تعلیم دی جائے۔ انھیں خاموش رہنے کی ہدایت کی جائے۔ انھیں خالی الذہنی کی سطح پر ہی شعور دیا جائے۔ اگرچہ بالغوں کے نزدیک بچے پرسکون اور مطمئن ہوتے ہیں بشرطیکہ درست انداز میں ان کی تربیت کی جائے۔ اگر انھیں روزانہ خواہ تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی

کم عمری اور تحمل اپنانے کی تعلیم دی جائے تو چودہ سال کے ہونے سے پہلے ہی ایک دروزاہ کھل جائے گا۔ جب جنس سر ابھارتی ہے' جب توانائی لبالب اور چھلکنے کو ہوتی ہے تو یہ پہلے سے کھلے دروازے ہی سے بہنا شروع کرتی ہے۔ وہ جنس کے تجربے سے بہت پہلے ہی سکون' سعادت' مسرت' عدم وقتی اور بے انائی کا ادراک کر چکے ہوتے ہیں۔ یہی پیشگی آشنائی انھیں اپنی توانائی غلط راستوں سے ضائع ہونے سے بچاتی ہے اور اس کا رخ راہ راست کی طرف موڑتی ہے۔

متحمل مراقبے کی تعلیمات کی بجائے ہم بچوں کو جنس سے بچانے کے لئے غلط تعلیم دیتے ہیں کہ جنس گناہ ہے۔ جنس غلیظ ہے' مکروہ ہے' شر ہے۔ یہ جہنم ہے۔ بہر حال گالیاں دینے سے صورت حالات تو تبدیل نہیں ہوا کرتی۔ بلکہ نتیجہ الٹ رونما ہوتا ہے' بچے اس جہنم کے متعلق' اس غلاظت' اس شر کے بارے میں جاننے میں زیادہ تجسس ظاہر کرتے ہیں' جس کے بارے میں والدین اور اساتذہ مستقلا گھبراہٹ اور خوف کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ اس تجسس کی تسکین کے لئے اپنے ذہنوں میں ابھرتے ہوئے سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کے لئے ہر جگہ' ہر طرف نظر دوڑاتے ہیں۔ وہ اس سارے ہنگامے کو سمجھنے کے لئے بے قرار ہو جاتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں یہ جنس آخر کس نوع کا "دوست" ہے؟ اور تھوڑے ہی عرصے میں وہ جان جاتے ہیں کہ ان کے بڑے بذات خود اسی معاملے میں شب و روز مستغرق ہیں جس کے بارے میں بچوں کے جاننے پر قدغنیں عائد ہیں۔ اس حقیقت کو جانتے ہی جو پہلا تاثر بچوں پر مرتب ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے ذہنوں سے والدین کے لئے تعریف کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ عموما" مانا جاتا ہے کہ جدید تعلیم والدین کے احترام میں بے اعتنائی کی ذمہ دار ہے درحقیقت والدین ان نتائج کے بذات خود ذمہ دار ہیں۔ بچے بہت جلد اس پیراڈاکس سے آگاہ ہو جاتے ہیں کہ والدین اسی شے میں بری طرح محو ہیں جس شے سے انھیں دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس آگاہی کی وجہ یہ ہے کہ بچوں کا مشاہدہ بہت درست ہوا کرتا ہے۔ وہ جان جاتے ہیں کہ تمہاری تبلیغ اور تمہارے اعمال ایک

دوسرے کے متضاد ہیں۔ قول و فعل میں فرق بہت نمایاں ہے۔ وہ گھر میں ہونے والے معاملوں کو توجہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ یہ اخذ کرتے ہیں کہ باپ اور ماں جس کی ملامت کرتے ہیں گھر میں وہی کچھ ہو رہا ہوتا ہے۔ وہ اس معاملے کو مکمل طور پر سمجھ جاتے ہیں اور والدین کا احترام ترک کر دیتے ہیں۔ بچے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ والدین منافق ہیں۔

اور یاد رکھو! جو بچے والدین پر ایقان کھو بیٹھیں ان میں خدا کا یقین کبھی پیدا نہیں ہوتا۔ بچے والدین میں اور ان کے وسیلے سے ہی خدا اور عقیدے کی پہلی جھلک دیکھتے ہیں۔ وہ والدین کی راست روی سے ہی خدا کا پہلا شعور حاصل کرتے ہیں۔ چھوٹے بچوں میں احترام پیدا کرنے والے اولین لوگ ان کے والدین ہوتے ہیں۔ اگر وہ ہی غیر حقیقی ثابت ہوں تو موت سے پہلے ان بچوں کو خدا کی طرف لانا مشکل ہو گا۔ چونکہ ان کی پہلی دیویاں ہی ان کو دھوکا دیتی ہیں۔ لہٰذا باطنی سمبندھ ٹوٹ جاتا ہے۔ ان کے والدین ناقابل احترام ثابت ہوتے ہیں۔ دور حاضر کی نوجوان نسل خدا کے وجود کو نہیں مانتی' نجات کے عقیدے اور مذہب کی اصطلاح کو ریاکاری قرار دے کر مذاق اڑاتی ہے۔

ایسا اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ تلاش و جستجو کے بعد اس شعور کو حاصل کرتے ہیں بلکہ ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ ان کے والدین نے انھیں دھوکا دیا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ پست ہو کر بدخو اور بے حیا ہو جاتے ہیں۔

بچوں میں والدین کی دھوکا دہی سے پیدا ہونیوالی اس نوع کی آگاہی بڑوں کی طرف سے حقیقت زندگی اور مرکز حیات یعنی جنس کے بارے میں گمراہ کن مظاہروں کے سبب سے پیدا ہوتی ہے۔ چھوٹوں پر ایمانداری سے اس حقیقت کو منکشف کرنا چاہیے کہ جنس زندگی کا جزو لاینفک ہے۔ ان کو بتایا جانا چاہیے کہ وہ جنس ہی سے پیدا ہوئے ہیں اور جنس ان کی زندگیوں کا بھی جزو لازم ہے۔ اس انکشاف و آگہی سے انھیں اپنے والدین کے رویوں کو درست تناظر میں سمجھنے میں مدد ملے گی اور جب وہ بڑے ہو کر

زندگی کے تجربات سے گزریں گے تو اپنے والدین کی ایمانداری کا ادراک کر کے ان کے لئے سراپا احترام بن جائیں گے۔ بچوں میں ایمان اور احترام پیدا ہوں گے تو ان کی بنیاد پر دینی زندگی استوار ہوگی۔

دور حاضر میں بچے اپنے والدین پر منافق اور غیر مخلص ہونے کا شبہ کرتے ہیں۔ لہذا نئی اور پرانی نسل کے مابین موجودہ تصادم ---- نظریاتی یا غیر نظریاتی طور پر بپا ہے جنس پر جبر کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ خاوند بیوی سے برگشتہ ہے اور بچے والدین کے نافرمان ہو چکے ہیں۔ نہیں! ہمیں جنس پر جبر مطلوب نہیں۔ جنس کی وضاحت دور حاضر کی ضرورت ہے۔ جونہی بچے باشعور ہوں اور جاننے کے متمنی ہوں اسی وقت والدین کو چاہیے کہ وہ خوش گوار انداز میں زندگی کے اصولی حقائق ان پر منکشف کریں۔ ایسا کچھ بچوں میں ناپسندیدہ حد تک تشویش اور تجسس پیدا ہونے سے پہلے کیا جانا چاہیے۔ انھیں اپنے تجسس واضطراب کی تسکین کے لئے غلط ذرائع اختیار کرنے سے پہلے آگاہ کر دیا جانا چاہیے۔ وگرنہ جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے بچے جاننا تو ضرور چاہیں گے مگر غلط لوگوں سے' برے حالات میں اور نقصان دہ طریقوں سے۔ یہ طریقے نہ صرف ضرر رساں بلکہ تباہ کن ہوتے ہیں۔ ان کے نتائج انھیں باقی ساری زندگی دکھ دیتے ہیں' اذیت پہنچاتے ہیں اور انجام کار والدین اور بچوں کے درمیان ایک گناہ آلود رازداری کی دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔ والدین اپنے بچوں کی جنسی حیات کے متعلق کچھ نہیں جان پاتے اور بچے والدین کی جنسی حیات سے لاتعلق رہتے ہیں۔ یہ اجنبیت' یہ لاتعلقی بہت خطرناک ہے۔ بچوں کو ضرور بالضرور جنس کے بارے میں تدبر کے ساتھ تعلیم دی جانی چاہیں' وہ تعلیم جو فی الحقیقت "سچی تعلیم" ہے۔

دوسرا یہ کہ انھیں مراقبے کی تعلیم دی جانی چاہیے۔ انھیں تعلیم دی جائے کہ پرسکون کیسے رہنا چاہیے' مطمئن کیونکر رہا جاتا ہے' خاموشی کس طرح اختیار کی جاتی ہے' خالی الذہنی کے مقام تک رسائی کیسے ممکن ہے۔ بچے اس کو بہت ہی جلد سیکھ جائیں گے۔ تمام والدین کو بچوں کے لئے "خاموشی اختیار" کرنے کا پروگرام شیڈول بنانا

چاہیے اور خود بھی اس پر عمل کرنا چاہیے۔ ہر گھر میں ایک گھنٹہ "خاموش بیٹھنے" کے لئے مخصوص کر دیا جانا ضروری ہے۔ اگر ایک وقت کا کھانا نہ کھایا جائے تو کوئی بات نہیں لیکن "خاموشی کا گھنٹہ" ضائع نہ کیا جائے۔ کسی "گھر" کو اس وقت تک "خاندان" کہنا غلط ہے جب تک وہاں "خاموشی کا گھنٹہ" نہیں بتایا جاتا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ وہ گھر بھی نہیں کہا جا سکتا۔

روزانہ "خاموشی کا گھنٹہ" توانائی کو بچائے گا۔ یہ ایک امنڈتی موج کا باعث بنے گا اور چودہ برس کی عمر میں یہ مراقبے کا دروازہ کھول دے گا۔ مراقبہ جس میں انسان "عدم وقتی" اور "بے انائی" کو مس کرتا ہے اور جس کے ذریعے روح اور رفیع ترین خدا کی جھلک پاتا ہے۔ جنس کے تجربے سے پیشتر ہی ترفع سے یہ باقاعدہ وصل جنس کے پیچھے جنونیوں کی طرح بھاگنے سے روکے گا اور توانائی ایک بہتر' مبارک ومسعود اور باوقار راستہ پائے گی۔ اور یہ تجرد کا پہلا مرحلہ ہے۔ یہ جنس سے بالاتر ہونا ہے۔ اور یہی مراقبہ ہے! دوسرا بنیادی اصول محبت ہے بچوں کو عہد طفلی ہی سے محبت کے اسباق پڑھائے جانے چاہئیں۔ ہمارا یہ خوف بے بنیاد ہے کہ محبت کی تعلیم بچوں کو جنس کی بھول بھلیوں میں لے جاتی ہے۔ جنس کی تعلیم بچوں کو محبت کی طرف لے جاتی ہے لیکن محبت کے بارے میں تعلیم انسان کو کبھی جنسیت کے خارزار میں نہیں گھسیٹتی۔ سچائی عمومی یقین سے مختلف ہے۔ جنس کی توانائی محبت میں ڈھالی جاتی ہے اور درست تناسب سے پھیلائی جاتی ہے۔ جو لوگ محبت سے معری ہیں وہ بہت زیادہ جنس زدہ ہیں۔ وہ زیادہ جنسیت زدہ ذہنیت رکھتے ہیں۔ محبت جتنی کم ہوتی ہے' نفرت اتنی بڑھتی ہے۔ زندگی میں جس قدر محبت کم ہو گی' اتنی ہی زندگی کینہ سے معمور ہوگی۔ جن لوگوں کے سینے محبت سے خالی ہوتے ہیں وہ حسد سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں۔ محبت جس قدر کم ہوتی ہے فساد اسی قدر زیادہ ہوتا ہے۔ جن لوگوں کی زندگی میں جتنی زیادہ پریشانی' ناخوشی اور پست احساسات ہوتے ہیں اتنی ہی زیادہ انسانی زندگیوں میں محبت کم ہوتی ہے۔

انسان جتنا زیادہ پریشانیوں' حسد' غرور اور جھوٹ میں گھرا ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کی توانائیاں کمزور' بیمار اور ناتواں ہوں گی۔ وہ ہر وقت تناؤ کا شکار رہے گا۔ اور ان خام اور گندے' گھٹیا اور پست جذبات کا اظہار صرف و محض جنس ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ گویا جتنا انسان ان گھٹیا سطحی' پست اور غلیظ جذبات میں گھرے گا اتنا ہی وہ جنسیت زدہ ہو گا۔

اس کے برعکس محبت توانائیوں کی قلب ماہیت کرتی ہے۔ محبت خلاق ہوتی ہے۔ اس میں جمود نہیں روانی ہوتی ہے۔ یہ رواں رہتی اور تشنگی کو مٹاتی ہے۔ اس سے جو طمانیت حاصل ہوتی ہے وہ جنس کے ذریعے حاصل ہونے والی طمانیت سے کہیں زیادہ بیش قدر اور گہری ہوتی ہے۔ جو شخص ایسی طمانیت سے آشنا ہو' کسی متبادل کی تلاش نہیں کرتا بالکل اس شخص کی طرح جسے ہیرے حاصل ہوں تو وہ پتھروں کی تلاش نہیں کرتا .... لیکن جو شخص نفرت سے معمور ہو وہ کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا۔ وہ ہمیشہ بے چین رہتا اور چیزوں کو برباد کرتا ہے۔ بربادی کبھی مسرت آفریں نہیں ہوتی۔ صرف تخلیقیت ہی طمانیت کی برسات کرتی ہے۔ ایک حسد سے بھرا ہوا شخص مقابلے بازی میں پڑ جاتا ہے لیکن اس سے اسے اطمینان کبھی نصیب نہیں ہوتا۔ ایک فسادی شخص دوسروں کو نقصان پہنچا کر ان سے آگے تو نکل جاتا ہے لیکن خوشی فقط دوسروں کو فائدہ پہنچا کر ہی حاصل ہو سکتی ہے' چھینا جھپٹی سے نہیں۔ چھینا جھپٹی اور دولت جمع کرنے سے کبھی اطمینان قلب حاصل نہیں ہو گا۔ یہ فقط دینے سے .... فائدہ بخش تقسیم سے ... حاصل ہو سکتی ہے خواہشوں کی آگ میں جلنے والا شخص ایک عہد سے دوسرے کی طرف بھاگتا رہتا ہے۔ وہ کبھی چین سے نہیں بیٹھتا۔ اس شخص کو وقار و مسرت حاصل ہوتی ہے جو طاقت کے پیچھے خوار نہیں ہوتا بلکہ جو محبت کے لئے تگ و دو کرتا ہے اور ہر کسی کے لئے ہر کہیں محبت بانٹتا ہے۔ انسان جتنا زیادہ محبت سے معمور ہوگا اس کے بطون باطن میں' روح میں' دل میں اتنی ہی طمانیت' گہرا اطمینان' خوشی اور کچھ پانے کا خوشگوار احساس موجزن ہو گا۔ ایسے تابندہ لوگ جنس کی طرف ذرا سا بھی نہیں دیکھتے۔

ایسا اس لئے ہوتا ہے کہ جو طمانیت و مسرت وہ جنس سے حاصل کر سکتے تھے وہی طمانیت و مسرت انھیں محبت سے "مستقلاً" حاصل ہو رہی ہے۔

اگلا اصول یہ ہے کہ محبت سے معمور ہونے کے لئے جیو۔ ہمیں محبت کی حمد و ثنا کرنی چاہیے' محبت کے لئے خود کو وقف کر دینا چاہیے اور محبت میں جینا چاہیے۔ محبت انسان کو لافانی بنا دیتی ہے۔ محبت کے لئے وقف ہونے سے پوری شخصیت محبت سے معمور ہو جاتی ہے۔ محبت "محبوب بننے" کی تعلیم ہے۔ ہم ایک پتھر کو بھی دوست کی طرح اٹھا سکتے ہیں اور ہم کسی دوست سے یوں بھی ہاتھ ملا سکتے ہیں گویا وہ دشمن ہو۔ کچھ لوگ مادی چیزوں کو بھی محبت بھری احتیاط سے سنبھالتے ہیں اور کچھ لوگ انسانوں تک سے بے جان چیزوں کے جیسا برتاؤ کرتے ہیں۔ ایک نفرت سے بھرے ہوئے شخص کے لئے انسان ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے بے جان اشیا۔ لیکن محبت سے معمور شخص بے جان چیزوں کو بھی چھو کر زندہ کر دیتا ہے۔ اس نے چھو کر مجھے پتھر سے پھر انسان کیا' مدتوں بعد میری آنکھوں میں آنسو آئے۔ ایک عالم سیاح ایک مشہور فقیر سے ملنے آیا۔ وہ آدمی کسی وجہ سے' شاید سفر کی سختی کی وجہ سے پریشان تھا۔ اس نے غصے سے اپنے جوتوں کے تسمے کھولے' جوتوں کو ایک کونے میں پھینکا اور دروازے کو زور دار دھکے سے کھولا۔ ایک مشتعل شخص جوتوں سے ایسا سلوک کرتا ہے گویا وہی اس کے دشمن ہیں اور دروازے کو اس طرح دھکیلتا ہے گویا دروازے اور اس کے درمیان عداوت ہو۔ اس شخص نے دروازے کو دھکا دے کر کھولا' اندر داخل ہوا اور فقیر کے حضور جھک کر سلام پیش کیا۔

فقیر نے کہا: "نہیں ...... میں تمہاری عقیدت کو قبول نہیں کرتا۔ جاؤ پہلے دروازے اور جوتوں سے معافی مانگو۔"

عالم سیاح نے حیرت کے ساتھ کہا: "اے لائق احترام بزرگ! دروازے اور جوتوں سے معافی مانگنے کا کیا مطلب؟ کیا یہ جاندار ہیں؟"

فقیر نے جواب دیا: "تم نے ان بے جان اشیا پر غصہ ظاہر کرتے ہوئے تو ایسا نہیں سوچا

تھا۔ تم نے جوتوں کو یوں پھینکا تھا گویا ان میں جان ہے۔ گویا یہ کسی غلطی کے مرتکب ہوئے ہیں۔ تم نے دروازے کو اس طرح کھولا گویا یہ تمہارا دشمن ہے۔ نہیں' جب تم غصے کے وقت ان کی ہستی کو تسلیم کر چکے ہو تو اب انہیں سے معافی بھی مانگنی چاہیے۔ براہ مہربانی جاو اور ان سے معافی طلب کرو ورنہ میں تم سے بات نہیں کروں گا۔"

سیاح نے سوچا جب وہ اتنی دور سے اس انوکھے فقیر سے ملاقات کے لئے آیا ہے تو یہ امر مضحکہ خیز ہے ایک فریق کی طرف سے بات چیت کو اتنے غیر اہم معاملے سے مشروط کر دیا جائے۔

اسے جوتوں کے پاس جانا اور کہنا پڑا: "دوستو! میں اپنی گستاخی پر معذرت خواہ ہوں۔" اس نے دروازے سے کہا: "معافی چاہتا ہوں' اس طرح غصے میں دھکیلنا میری غلطی تھی۔"

یہ اس کے لئے عجیب وقت تھا۔"

سیاح نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ اس کو شروع میں ایسا کرنا مضحکہ خیز لگا لیکن جب اس نے اپنا اعتراف خطا مکمل کر لیا تو اس کے اندر ایک نئی صبح طلوع ہوئی۔ اسے بہت سکون' اطمینان اور طمانیت محسوس ہوئی۔ یہ امر اس کے تصور سے بھی بعید تھا کہ کوئی انسان دروازے اور جوتوں سے معافی مانگ کر سکون' ٹھہراو اور مسرت پا سکتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ معافی مانگنے کے بعد وہ دوبارہ اندر گیا اور فقیر کے قریب بیٹھ گیا۔ فقیر ہنسنے لگا اور بولا: "ہاں' اب ٹھیک ہے۔ اب تم آہنگ میں ہو۔ ہم گفتگو کر سکتے ہیں۔ جیسے ہی تم نے محبت کا مظاہرہ کیا تم بوجھل نہیں رہے۔ اب ہمارے درمیان باطنی معبندھ قائم ہو سکتا ہے۔"

صرف انسانوں سے محبت کرنا ہی کامل ہونے کے لئے کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لئے محبت سے سراپا معمور ہونا لازمی ہے۔ یہ مقولہ درست نہیں ہے کہ "محبت تمہاری ماں ہے۔" اگر کوئی باپ خود سے محبت کا اس لئے کہے کہ وہ باپ ہے تو یہ تعلیم غلط ہو گی۔ وہ محبت کے لئے وجہ ظاہر کر رہا ہے۔ اگر ایک ماں بچے سے کہے کہ

چونکہ وہ اس کی ماں ہے اس لئے اس سے محبت کی جائے تو یہ مطالبہ غلط ہو گا کیونکہ جس محبت کے ساتھ "کیونکہ" اور "اس لئے" کی رسیاں بندھی ہوں وہ محبت کی اصطلاح کا غلط استعمال ہو گا۔ محبت افلاطونی ہونی چاہیے۔ بے غرض ہونی چاہیے۔ اسے توجیہات میں نہیں پھنسانا چاہیے۔ ماں کہتی ہے: "میں تمہاری دیکھ بھال کرتی ہوں' میں تمہاری پرورش کرتی ہوں' لٰہذا مجھ سے محبت کرو۔" وہ وجہ ظاہر کر رہی ہے۔ وجہ ظاہر کرنے سے محبت ختم ہو جاتی ہے۔ اگر مجبور کیا جائے تو ممکن ہے بچہ یونہی کچھ انس ظاہر کر دے کیونکہ آخر کو وہ اس کی ماں ہے۔

نہیں' محبت کی تعلیم دینے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی وجہ یا مقصد کے لئے محبت ظاہر کی جائے بلکہ اس کا مقصد بچے کے لئے ایسا ماحول تخلیق کرنا ہے کہ وہ محبت سے سراپا معمور ہو۔ یہ ذہن نشین کر لیا جانا چاہیے کہ یہ بچے کی شخصیت کی نشوونما کا معاملہ ہے' اس کے مستقبل کا معاملہ ہے' اس کی خوشی کا معاملہ ہے کہ وہ جس کسی سے ملے اس کا محب بن جائے خواہ وہ پتھر ہو' انسان ہو' پھول ہو' جانور ہو' کچھ بھی ہو۔ منشا صرف یہ نہیں ہے کہ جانور سے یا پھول سے یا ماں سے یا کسی سے بھی محبت کرنی ہے بلکہ منشا یہ ہے کہ محبت سے معمور ہوا جائے کہ اسی پہ مستقبل کا انحصار ہے ------ انسانیت کے مستقبل کا۔ خوشی سے پہنچنے کے بافراط امکان کا انحصار اس پہ ہے کہ تمہارے اندر کس قدر محبت ہے! کوئی بھی محبت کرنے والا شخص جنسیت سے آزاد ہوتا ہے۔ لیکن ہم محبت عطا نہیں کرتے' ہم محبت کے لئے ولولہ پیدا نہیں کرتے۔ یقیناً ہم کبھی کبھار تعریف کرانے کے لئے محبت کے نام پر پست ذوق کا مظاہرہ کرتے ہیں! ------ کیا تم کسی ایسے آدمی کے متعلق سوچ بھی سکتے ہو جو ایک انسان سے محبت کر رہا ہو اور ساتھ ہی کسی دوسرے انسان سے نفرت بھی کر رہا ہو؟ نہیں' یہ ناممکن ہے۔ ایک محبت کرنے والا شخص صرف محبت کرنے والا ہی ہوتا ہے' وہ شخصیات کی پروا نہیں کرتا۔ ایک محبت کرنے والا انسان تنہا بھی ہو تو محبت سے معمور ہو گا کیونکہ محبت اس کی ذات' اس کی فطرت ہے۔ اس کے تمہارے ساتھ تعلق کی کوئی وجہ لازمی

نہیں۔ ایک مشتعل آدمی تنہا بھی ہو تو اشتعال میں ہوتا ہے۔ ایک نفرت سے بھرا ہوا آدمی تنہائی میں بھی نفرت ہی کر رہا ہوتا ہے۔ ایسے کسی آدمی کو جب وہ تنہا ہو تو ایک نظر دیکھو' تم محسوس کرو گے کہ اگرچہ وہ کسی خاص شخص کو غصہ نہیں دکھا رہا تاہم وہ غصے میں ہے۔ اس کا سارا وجود نفرت سے' غصے سے چھلک رہا ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اگر تم کسی محبت سے معمور شخص کو دیکھو' خواہ وہ تنہا ہی کیوں نہ ہو' تو تم محسوس کرو گے کہ وہ محبت سے چھلک رہا ہے! پھول جنگل میں بھی کھلتے اور خوش بو بکھیرتے ہیں خواہ کوئی تعریف کرنے والا ہو یا نہ ہو خواہ کوئی وہاں سے گزرے یا نہیں' ایک پھول ہمیشہ اپنی داخلی خوشبو بکھیرتا ہی رہتا ہے۔ خوشبو اس کی فطرت ہے۔ اس مغالطے میں مت رہنا کہ پھول تمہارے لئے خوشبو بکھیرتا ہے! ہماری ہستیوں کو محبت سے معمور ہونا چاہیے۔ اس کا انحصار اس پر نہیں ہونا چاہیے جس سے ہم محبت کرتے ہیں!

لیکن محبت کرنے والا محبت کے لئے واحد محبوب کی خواہش کرتا ہے' ہر کسی سے محبت نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے: "محبت کا مطلب ہے صرف میرے لئے۔" وہ نہیں جانتا کہ جو سب سے محبت نہیں کر سکتا وہ ایک سے بھی محبت نہیں کر سکتا۔ بیوی کہتی ہے کہ خاوند کو صرف اسی سے محبت کرنی چاہیے اور کسی دوسری عورت سے انس ظاہر نہیں کرنا چاہیے۔ وہ نہیں جانتی کہ ایسی محبت جھوٹی ہوتی ہے اور اس کی ذمہ دار وہ خود ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ جو خاوند ہر کسی سے محبت کے لئے ہمہ وقت معمور نہیں ہے وہ بیوی کے لئے "محبت کرنے والا" ہو؟ محب ہونا زندگی کی فطرت ہے۔ یہ کسی کے لئے محبت سے معمور کسی کے لئے محبت سے عاری ہو' ممکن ہی نہیں ہے۔

لیکن انسانیت اس سادہ سے سچ کو دیکھنے کی اہل نہیں ہو سکی۔ باپ ہمیشہ کہتا ہے کہ بچہ اس سے محبت کرے۔ لیکن کیا اس نے کبھی گھر کے بوڑھے ملازم سے محبت کرنے کا اسے کہا؟ نہیں ------ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ملازم ہے۔ تو کیا وہ انسان نہیں ہے؟ ممکن ہے ملازم بوڑھا ہو لیکن وہ کسی کا باپ بھی تو ہو سکتا ہے۔ چونکہ وہ

ایک ملازم ہے لہٰذا اس سے محبت کرنے کا اس کا ادب کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن وہ باپ یہ نہیں جانتا کہ بچے کے بڑا ہونے پر وہ شکوہ کناں ہو گا کہ اس کا بیٹا اس سے محبت نہیں کرتا۔ بچہ پرورش پا کر محبت سے معمور تو نہیں بن جاتا ہے لیکن کیا اسے سب سے محبت کرنے کی تعلیم دی گئی ہے؟ پھر وہ کیسے اپنے بوڑھے باپ کا احترام کرے!

محبت کسی تعلق کا نام نہیں' یہ تو ایک ذہنی کیفیت ہے۔ یہ تو انسان کی شخصیت ساز ہے۔ لہٰذا محبت کی تعلیمات کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ سب سے محبت کرو۔ اگر کوئی بچہ ایک کتاب تک کو درست طریقے سے نہیں سنبھالتا تو اسے توجہ دلائی جانی چاہیے کہ کتاب کو نادرست طریقے سے رکھنا اس کی اپنی شخصیت کے لئے نقصان رساں ہے۔ اس کو خبردار ضرور کر دیا جانا چاہیے کہ اگر وہ کتاب سے اس طرح کا برتاو کرے گا تو لوگ کیا کیا باتیں نہیں کریں گے۔ اگر تم اپنے کتے سے بھی سخت برتاو کرتے ہو تو یہ تمہاری شخصیت کی خامی تصور ہوتی ہے۔ یہ تمہارے وجود کے محبت سے خالی ہونے کا ثبوت ہے۔ اور جو محبت سے معمور نہیں ہے وہ انسان ہی نہیں ہے۔

میں تمہیں ایک درویش کی کہانی سناتا ہوں۔ وہ ایک جھونپڑی میں رہتا تھا۔ آدھی رات کا وقت تھا کہ موسلادھار بارش برسنے لگی۔ درویش اور اس کی بیوی اس وقت گہری نیند سو رہے تھے۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ ممکن ہے کوئی شخص پناہ کا طلب گار ہو۔ درویش نے اپنی بیوی کو جگایا اور بولا: "باہر کوئی ہے ..... شاید کوئی مسافر' کوئی اجنبی دوست۔"

میرے عزیزو! کیا تم نے غور کیا کہ درویش نے کہا "کوئی اجنبی دوست۔" ہم ہیں کہ کسی آشنا کو بھی دوست نہیں بناتے۔ درویش کا رویہ محبت کا رویہ تھا۔

درویش نے کہا: "کوئی اجنبی دوست باہر انتظار کر رہا ہے۔ براہ مہربانی دروازہ کھول دو۔" اس کی بیوی نے کہا: "اندر جگہ کہاں ہے؟ یہ جھونپڑی تو ہمارے لئے بھی ناکافی ہے۔ ایک اور شخص کس طرح اس میں سما سکے گا؟" درویش بولا: "میری جان! یہ کسی نواب

کا محل نہیں ہے کہ چھوٹا پڑ جائے گا۔ یہ ایک غریب کی جھونپڑی ہے۔ نواب کا محل فقط ایک مہمان ہی کے آنے سے چھوٹا پڑ جاتا ہے۔"

بیوی نے کہا:"یہ امیر اور غریب کا مسئلہ درمیان میں کہاں سے آ گیا؟ سادہ سی حقیقت ہے کہ ایک چھوٹی سی جگہ ہے۔"

درویش بولا:"اگر دل میں کشادگی ہو تو تمہیں جھونپڑی بھی محل لگے گی۔ اور اگر دل ہی تنگ ہو تو نہ صرف محل چھوٹا دکھائی دینے لگتا ہے بلکہ جھونپڑی تو بالکل ہی چھوٹی محسوس ہونے لگتی ہے۔ مہربانی کر کے دروازہ کھول دو۔ ہم اپنے در پر آنے والے کسی شخص کو کیونکر لوٹا سکتے ہیں؟ اب تک ہم دونوں لیٹے رہے تھے۔ ہم تین ہو گئے تو لیٹ نہیں سکیں گے نا! تو کیا ہوا ہم بیٹھ تو سکتے ہیں۔ جھونپڑی میں بیٹھنے کی کافی گنجائش ہے۔"

درویش کی بیوی کو دروازہ کھولنا پڑا۔ دوست اندر آ گیا۔ وہ بری طرح بھیگا ہوا تھا۔ لہٰذا اس کے کپڑے بدلوائے گئے۔ پھر وہ اکٹھے بیٹھ گئے اور گپ شپ کرنے لگے۔

اس دوران میں دروازہ بند کر دیا گیا۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ دو اور اشخاص نے دروازے پر دستک دی۔ درویش نے کہا:" ایسا لگتا ہے کوئی اور پناہ کا خواہش مند آیا ہے۔" اس نے اپنے نئے دوست کو جو دروازے کے قریب بیٹھا تھا دروازہ کھولنے کا کہا۔ وہ آدمی بولا:" دروزاہ کیوں کھولا جائے؟ جگہ نہیں ہے۔" اس شخص نے جسے چند منٹ پیشتر ہی اس جھونپڑی میں پناہ ملی تھی بھلا دیا کہ درویش کی محبت نے اس کے لئے ــــ اجنبی کے لئے گنجائش پیدا کی تھی بلکہ گنجائش تو اس لئے پیدا ہوئی تھی کہ جھونپڑی میں محبت تھی۔ جب جب نئے اشخاص وارد ہوتے ہیں محبت ان کے لئے جگہ نکالتی ہے۔ دوست بولا:" دروازہ کھولنا کیا ضروری ہے؟ تم دیکھ نہیں رہے کہ ہمیں کس وقت کے ساتھ گھٹنے جوڑ کر بیٹھنا پڑ رہا ہے۔" درویش نے کہا:" اجنبی! کیا میں نے تمہارے لئے جگہ نہیں نکالی تھی؟ تمہیں اس لئے داخل ہونے کی اجازت ملی تھی کہ محبت یہاں تھی اور محبت ہنوز یہاں ہے ــــ تمہارے آ جانے سے ختم نہیں ہو گئی۔

مہربانی کر کے دروازہ کھول دو۔ ابھی ہم ذرا پرے پرے بیٹھے ہیں پھر ہم جڑ کر بیٹھ جائیں گے۔ سرد رات میں اس طرح نزدیک تر بیٹھنے سے حرارت بھی ملے گی۔"

دروازہ کھولنا پڑا۔ دونوں نو وارد اندر داخل ہوئے۔ وہ سب اکٹھے بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ وقت گزرتا رہا' بارش برستی رہی' شب بیتتی رہی۔ ایک گدھا آیا اور اس نے دروزاے کو سر سے دھکیلا گدھا بارش میں بھیگ کر سردی سے ٹھٹھر رہا تھا اور رات بھر کے لئے پناہ کا متلاشی تھا۔ فقیر نے نواردوں میں سے ایک کو جو دروزاے کے بالکل قریب بیٹھا تھا دروازہ کھولنے کا کہا:"کچھ نئے دوست آئے ہیں۔"

اس آدمی نے باہر جھانکا اور بولا:"باہر کوئی دوست دوست نہیں بلکہ ایک گدھا کھڑا ہے۔ دروازہ کھولنا ضروری نہیں۔"

درویش نے کہا:"شاید تم اس حقیقت سے بے خبر ہو کہ امیروں کے در پر انسانوں سے جانوروں جیسا برتاو کیا جاتا ہے۔ یہ ایک مفلس درویش کی جھونپڑی ہے اور ہم تو جانوروں سے بھی انسانوں جیسا سلوک کرنے کے عادی ہیں۔ براہ مہربانی دروازہ کھول دو۔"

وہ سب یک زبان ہو کر بول اٹھے:" لیکن جگہ کہاں ہے؟"

درویش نے کشادہ دلی سے کہا:" جگہ بہت ہے۔ ہم بجائے بیٹھنے کے کھڑے ہو سکتے ہیں' یوں کافی جگہ نکل آئے گی۔ فکر مت کرو' اگر ضرورت پڑی تو میں گنجائش پیدا کرنے کے لئے باہر چلا جاوں گا۔ کیا محبت اتنا بھی نہیں کر سکتی؟"

دل کو محبت سے معمور رکھنا ضروری ہے۔ محبت بھرا رویہ وہی ہوتا ہے جو ہم روا رکھتے ہیں۔ انسان میں انسانیت فقط اس وقت جنم لیتی ہے جب اس کا دل محبت سے معمور ہو' ایک پر مسرت طمانیت جس کا جزو لینفنگ ہے۔ کیا تم نے کبھی توجہ کی کہ جب تم کسی سے ذرا سی بھی محبت ظاہر کرتے ہو تو طمانیت کی ایک لہر' خوشی کی ایک موج تمہارے سارے وجود پر چھا جاتی ہے؟ کیا تم نے کبھی محسوس کیا ہے کہ غیر مشروط محبت کے لمحات ہی سکون آمیز طمانیت کے لمحات ہوتے ہیں؟ اور خالص محبت

اسی وقت پنپتی ہے جب اس میں کسی شرط کی ملاوٹ نہ کی گئی ہو۔ مشروط محبت کوئی محبت نہیں ہوتی۔ کیا تم نے کبھی گلی سے گزرنے والے کسی اجنبی کو بے ساختہ مسکراہٹ سے نواز کر آسودہ خاطری محسوس نہیں کی ہے؟ کیا اس کے ہمراہ سکون کی صبا نے تمہاری روح کو نہیں مہکایا؟ سکون آمیز خوشی کی اس لہر کی کوئی حد ہی نہیں ہوتی جو کسی گرتے ہوئے شخص کو سہارا دینے سے یا کسی بیمار کو پھولوں کا تحفہ دینے سے تمہیں محسوس ہوتی ہے۔ کسی کو تحفہ دینے کا صلہ مسرت ہے' اس میں رشتے اور تعلق کی کوئی قید نہیں۔

محبت کو اندر سے ابھرنا چاہیے۔ ایسی محبت جو پودوں سے ہو' انسانوں سے ہو' ناواقفوں سے ہو' پردیسیوں سے ہو' دور واقع چاند ستاروں سے ہو! محبت کو ہمیشہ بڑھتے رہنا چاہیے۔ جتنی تمہارے اندر محبت بڑھتی جائے گی اتنا ہی زندگی میں جنس کا امکان کم ہوتا جائے گا۔

محبت اور مراقبے سے باب الہیٰ وا ہوتا ہے۔ محبت اور مراقبہ اکٹھے خدا سے وصال پاتے ہیں اور زندگی میں تجرد کے پھول کھلاتے ہیں۔ تب ساری قوت حیات ایک نئے وسیلے سے بالاتری حاصل کرتی ہے اور باہر کو نہیں بہتی۔ یہ باہر کو بہنے کی وجہ سے زوال پانے کی بجائے اندر ہی رہتے ہوئے عروج پاتی ہے۔ ایسا عروج جو جنت میں قیام کے مترادف ہے۔ فی الحال ہمارا سفر پست سطح کو ہے' جنسی توانائی فطرتاً" فقط نشیب کو بہتی ہے۔ تجرد قوت حیات کی اوج سفر ہے۔ اور محبت اور مراقبہ تجرد کے حقیقی اجزائے ترکیبی ہیں۔

کل ہم بتائیں گے کہ تجرد سے کیا ملتا ہے۔ ہم اس سے کیا حاصل کرتے ہیں؟ ہم کن رفعتوں تک پہنچ جاتے ہیں؟

فی الحال میں تمہیں دو چیزوں محبت اور مراقبے کے متعلق بتاتا ہوں۔ میں نے تمہیں پہلے بتایا ہے کہ تربیت کو عہد طفلی ہی سے شروع کرنا چاہیے۔ تم اسے نہیں حاصل کرسکتے کیونکہ تم بچے نہیں ہو اور اب تمہارے ساتھ کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ اس

صورت حالات میں میری محنتیں رائیگاں جائیں گی۔ خیر تمہاری عمر کچھ بھی کیوں نہ ہو یہ نیک کام کسی بھی دن شروع کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ عمر بڑھنے کے ساتھ یہ دشوار تر ہو جاتا ہے تاہم اس راستے پر تم سفر کا آغاز زندگی کے کسی بھی لمحے میں کر سکتے ہو۔ گو کہ بچپنے میں اس کا آغاز کامیابی میں معاون ہوتا ہے تاہم یہ بھی بہتر ہے کہ زندگی کے کسی بھی مرحلے پر تم اسے شروع کردو۔

ہم اسے آج ہی شروع کر سکتے ہیں۔ بڑے جو سیکھنے کے لئے رضامند ہیں اور ان میں سیکھنے کا رجحان ہے وہ بڑے ہونے کے باوجود بچے ہی ہیں۔ بس وہ نئے سرے سے آغاز کر سکتے ہیں۔ اگر وہ لاپرواہی نہ برتیں تو کچھ بھی سیکھ سکتے ہیں یا ان کی جو آرزو ہے پوری ہو سکتی ہے۔

مہاتما بدھ کا ایک شاگرد کئی برس سے ان سے فیض یاب ہوتا رہا۔ ایک روز مہاتما بدھ نے اس سے دریافت کیا: "تمہاری عمر کیا ہے؟" شاگرد نے کہا: "پانچ سال۔" مہاتما بدھ نے حیران ہو کر پوچھا: "پانچ سال؟ تم تو ستر سال کے بوڑھے دکھائی دیتے ہو۔ یہ کیسا مذاق ہے؟" شاگرد نے جواب دیا: "میں نے ایسا اس لئے کہا ہے کہ مراقبے کی کرن پانچ برس پہلے ہی مجھ میں داخل ہوئی تھی۔ گزشتہ پانچ برسوں سے محبت میری زندگی میں بارش کی طرح برس رہی ہے۔ اس سے قبل میری زندگی ایسی تھی گویا میں خوابوں میں جی رہا ہوں' وہ زندگی نیند کی زندگی تھی۔ میں ان برسوں کو اپنی عمر میں شمار نہیں کرتا۔ میں ایسا کر بھی کیسے سکتا ہوں؟ حقیقی زندگی کا آغاز تو ہوا ہی پانچ برس قبل ہے۔ لہٰذا میں نے کہا کہ میری عمر صرف پانچ سال ہے۔"

مہاتما بدھ کو اس کی یہ بات اتنی پسند آئی کہ انہوں نے اپنے سارے شاگردوں کو اس بات پر دھیان دینے' غور کرنے کی تلقین کی۔ تم سب کو اپنی عمر اسی طرح سے شمار کرنی ہوگی اور مذکورہ بالا معیار ہے عمر کے شمار کا۔ اگر محبت اور مراقبے نے ہنوز جنم نہیں لیا تو تمہاری زندگی آج تک صرف و محض نفی میں گزری ہے۔ جانو تم پیدا ہی نہیں ہوئے۔ تاہم کبھی اتنی دیر نہیں ہوئی ہوتی کہ ہم کوشش کا آغاز ہی نہ کر پائیں۔

ہمیں برتر حیات تک رسائی کی کوششیں کرنی چاہئیں اور یاد رکھو اس میں کبھی دیر نہیں ہوئی ہوتی۔ لہٰذا میری گفتگو سے یہ مت اخذ کر بیٹھنا کہ چونکہ تم بچپنا گزار آئے ہو اور میری باتیں صرف و محض آنے والی نسل کے لئے ہیں۔ کوئی شخص غلط راستے پر چل پڑے تو وہ کسی بھی وقت درست راستے کو پلٹ سکتا ہے۔ کوئی شخص اتنا خود رائے نہیں ہوا کرتا کہ وہ حقیقی روشنی کو حاصل نہ کر سکتا ہو۔ طمانیت اور کامیابی کے ساتھ روشنی کی طرف واپسی میں زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑتی۔ اس روشنی کی کرن — اس خوشی' اس سچائی — کی محض ایک جھلک ہی ہمیں احساس دلا جاتی ہے کہ ہم زیادہ جدوجہد کئے بغیر بھی بہت کچھ پا سکتے ہیں۔ ہم نہایت معمولی مشقت سے انتہائی بیش قدر شے کو پا سکتے ہیں۔ براہ مہربانی اس کو غلط زاویہ نگاہ سے مت دیکھنا ...... بس یہی میری تم سے عاجزانہ درخواست ہے۔

چوتھا باب

جنس: عظمیٰ جوہر

جان عزیز!

ایک کہانی سنو۔ ایک چھوٹی سی بستی کے سکول میں استاد راما کی کہانی پڑھا رہا تھا۔ تقریباً" تمام شاگرد اونگھ رہے تھے۔ رامائن کی قرات کے دوران میں اس طرح کا واقعہ کوئی غیر معمولی امر نہیں ہے۔ بچے تو کیا بڑے بھی رامائن سنتے وقت اونگھ رہے ہوتے ہیں کیونکہ یہ کہانی ہزاروں مرتبہ سنائے جانے کی وجہ سے اہمیت کھو چکی ہے۔ اس کا انوکھا پن فرسودگی میں بدل چکا ہے۔ وہ استاد بھی اپنے سامنے دھری کتاب کو ایک نظر دیکھے بغیر میکانکی طور سے قرات کرتا چلا جا رہا تھا۔ کوئی باہر سے دیکھتا تو بچوں کے ساتھ استاد کو بھی اونگھتا ہوا محسوس کرتا۔ رامائن اسے زبانی یاد تھی اور وہ طوطے کی طرح سنائے چلا جا رہا تھا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے کیونکہ یہ ایک آفاقی حقیقت ہے کہ جو لوگ کوئی شے رٹتے ہیں وہ اس کے مفہوم سے نا آشنا ہی رہتے ہیں۔

اچانک وہاں سنسنی پھیل گئی۔ انسپکٹر کمرہ جماعت میں آ گیا تھا۔ طلبا ہوشیار ہو گئے' استاد بھی مستعد ہو کر پڑھانے لگا۔ انسپکٹر نے کہا "تمہیں رامائن پڑھاتے دیکھ کر مجھے مسرت ہوئی۔ میں راما کے متعلق کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔"

یہ سوچتے ہوئے کہ بچے باآسانی توڑنے اور پیٹنے کو یاد رکھتے ہیں اس نے سادہ سا سوال پوچھا: "شنکارا کی کمان کس نے توڑی تھی؟"

ایک لڑکا ہاتھ اٹھا کر تیزی سے کھڑا ہوتے ہوئے بولا: "معافی چاہتا ہوں جناب! میں

نے اسے نہیں توڑا۔ میں تو چودہ دن سے چھٹی پر تھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ کس نے اسے توڑا ہے۔ میں شروع ہی میں واضح کرنا چاہتا ہوں کیونکہ جب کبھی سکول میں کوئی حادثہ ہوتا ہے' مجھے سب سے پہلے الزام دیا جاتا ہے۔"

انسپکٹر پر تو گویا بجلی سی گر پڑی۔ اس نے استاد کی طرف دیکھا جو شاگرد کو پیٹنے کے لئے بید اٹھا ہی رہا تھا۔

استاد نے کہا "یقیناً یہی مجرم ہے۔ یہ سب سے زیادہ شرارتی ہے۔" اس کے ساتھ ہی وہ لڑکے کو ڈانٹتے ہوئے کہنے لگا "اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو پھر تم نے اٹھ کر اپنی صفائی کیوں پیش کی؟" اس نے انسپکٹر کو مشورہ دیا کہ وہ لڑکے کی میٹھی میٹھی باتوں سن کر گمراہ نہ ہو۔

انسپکٹر نے سوچا کہ اسے کچھ کہنا عقل مندی نہیں ہو گی۔ وہ مڑا اور کمرہ جماعت سے نکل آیا۔

انسپکٹر غصے میں سیدھا ہیڈ ماسٹر کے دفتر گیا اور تفصیل سے سارا واقعہ اسے بتایا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہیڈ ماسٹر اس حوالے سے کچھ کرے۔ ہیڈ ماسٹر نے الٹا اس کو زور دے کر کہا کہ انسپکٹر اس معاملے کو ٹھپ کر دے کیونکہ ان دنوں طلبا کو کچھ کہنا خطرناک ہے۔ جو کچھ بھی ٹوٹا ہے' جس کسی نے بھی توڑا ہے اس بات کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ دو ماہ پہلے تک سکول میں کافی بدامنی اور گڑ بڑ تھی' اب کچھ سکون ہوا ہے۔ اس سے پیشتر کہ طلبا زیادہ تر فرنیچر جلا اور توڑ دیں بہتر یہی ہے کہ خاموشی اختیار کی جائے۔ آج کل طلبا کو کچھ کہنا مصیبت کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ کسی بھی وقت وہ ہڑتال' دھرنا یا تادم مرگ بھوک ہڑتال کر سکتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا سوائے اس کے کہ جو کچھ بھی ہو اس پر نگاہ رکھی جائے۔

انسپکٹر سخت حیران ہوا۔ وہ تو سن ہو کر رہ گیا۔ وہ سکول کمیٹی کے چیرمین سے ملا اور تمام واقعے سے اسے آگاہ کیا۔ اس نے بتایا کہ کمرہ جماعت میں رامائن پڑھائی جا رہی تھی۔ ایک لڑکے نے سوال کے جواب میں بتایا کہ سنکارا کی کمان اس نے نہیں توڑی'

استاد کہتا ہے کہ یہی لڑکا ذمہ دار ہے' ہیڈ ماسٹر التجا کر رہا ہے کہ معاملے کو رفع دفع کر دیا جائے خواہ ذمہ دار کوئی ہو' وہ ہڑتال کے خوف میں مبتلا ہے اور معاملے کو انجام تک پہنچانے کو غیر دانش مندانہ قدم سمجھتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

انسپکٹر نے ساری تفصیل سنا کر چیرمین کی رائے چاہی۔ چیرمین نے کہا کہ ہیڈ ماسٹر کی پالیسی واقعتاً" دانش مندانہ ہے۔ اس نے مزید کہا کہ مجرم طالب علم کو تنگ نہیں کیا جائے۔ اس نے جو کچھ بھی توڑا ہے کمیٹی خود اس کی مرمت کروالے گی۔ مرمت کروانا ہی بہتر ہے بہ نسبت اس کی گہرائی میں جانے کے۔

انسپکٹر نے جو اس جہالت وحماقت والی صورتحال سے کراہت میں مبتلا تھا' مجھے اپنا تجربہ بیان کیا۔ میں نے اسے کہا کہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کہانی میں کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ یہ ایک عام انسانی کمزوری ہے کہ لوگ جس شے کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتے ہوں اسی کے متعلق شیخی بگھارتے ہیں۔ کسی کو بھی یاد نہیں ہوتا کہ سنکارا کی کمان کس نے توڑی تھی۔ کیا ان کے لئے یہ بہتر نہیں تھا کہ وہ پوچھ لیتے کہ سنکارا کی کمان کس نے توڑی لیکن کوئی بھی اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے۔ کوئی شخص بھی اتنا بہادر نہیں ہے۔ انسانیت کی تاریخ میں یہی سب سے بڑی بدقسمتی رہی ہے۔ یہ خاص خودکشی ثابت ہوئی ہے۔ ہم یوں ظاہر کرتے ہیں گویا سب کچھ جانتے ہیں۔ تمام مسئلوں کے متعلق ہمارے جواب ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے اس بچے' استاد' ہیڈ ماسٹر اور چیرمین کے تھے۔ سوال کو صحیح طور پر سمجھے بغیر جواب دینے کی کوشش انسان کو احمق بنا دیتا ہے۔ یہ خود فریبی ہے۔ مزید یہ کہ اس حوالے سے بے اعتنائی کا رجحان بھی موجود ہے۔ اگر ہم نہیں جانتے کہ سنکارا کی کمان کس نے توڑی ہے تو جائے جہنم میں!

اس احمقانہ کہانی والے مسئلے کے برعکس زندگی میں بہت گہرے مسائل ہوتے ہیں جن کے درست حل پر ہی منحصر ہوتا ہے کہ زندگی بہتر ہو گی یا خراب' ہم آہنگ ہو گی یا غیر ہم آہنگ نیز ترقی کا درست راستہ کونسا ہے؟ ہم سوچتے ہیں کہ ہمیں مسئلوں

کا حل معلوم ہے۔ حالانکہ نتائج ہی سے ظاہر ہوا کرتا ہے کہ زندگی کے متعلق ہمارا نکتہ نظر کس قدر درست تھا۔ ہم میں سے ہر ایک کی زندگی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہم زندگی کے بارے میں کچھ بھی تو آگاہی نہیں رکھتے ورنہ ہماری زندگیوں میں اتنی مایوسی' اس قدر بے بسی اور اتنا اضطراب نہ ہوتا۔

یہی کچھ میں جنس کے متعلق ہماری آگاہی کے حوالے سے کہوں گا کہ ہم اس کے متعلق کچھ بھی تو نہیں جانتے۔ شاید تم اس بات سے اتفاق نہیں کرو گے۔ تم بحث کرتے ہوئے کہو گے: "یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہم روح یا خدا کے متعلق کچھ نہ جانتے ہوں لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم جنس کے متعلق کچھ بھی نہ جانتے ہوں؟" ممکن ہے کہ تم دلیل دو کہ تم شادی شدہ ہو' تمہارے بچے ہیں۔ تاہم اس کے باوجود میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ تم جنس کے متعلق علم نہیں رکھتے! میری بات سے اتفاق کرنا واقعتہً" دشوار ہے۔ تم ضرور جنسی تجربات سے گزرے ہو گے لیکن جنس کے بارے میں اس سے زیادہ علم نہیں رکھتے جتنا کہ جانور۔ کسی عمل سے میکانکی طور پر گزرنا اس کے علم کے لئے کافی نہیں ہوا کرتا۔

ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی نے ہزاروں میل کار ڈرائیو کی ہو لیکن یہ لازمی نہیں کہ اسے انجن کے بارے میں آگاہی بھی حاصل ہو' کار بنانے یا کار کے کام کرنے کے بارے میں علم ہو۔ ممکن ہے وہ میری بات کا یہ کہہ کر مذاق اڑائے کہ وہ ہزاروں میل کار چلا چکا ہے اور ہنوز چلاتا ہے' تاہم میں اسے یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ وہ کار کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا! میں دہرائے دیتا ہوں کہ کار ڈرائیو کر لینا الگ بات ہے اور کار کا میکنزم سمجھنا الگ معاملہ ہے۔

وہ کہے کہ وہ بجلی کے متعلق سب کچھ جانتا ہے کیونکہ وہ جب چاہے سوئچ دبا کر بجلی کو روشن کر سکتا ہے یا بجھا سکتا ہے تو ہم اسے بے وقوف قرار دیں گے۔ کوئی بچہ بھی سوئچ دبا کر بجلی کو روشن کر سکتا ہے یا بجھا سکتا ہے۔ بجلی کا علم اسے ہو یہ لازمی نہیں۔

شادی ہر کوئی کر سکتا ہے۔ بچے ہر کوئی پیدا کر سکتا ہے۔ اس سے تو جنس کا علم حاصل نہیں ہو جاتا۔ جانور بھی افزائش نسل کرتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ جنس کے متعلق علم رکھتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جنس کو سائنسی انداز میں پڑھایا نہیں جاتا ہے۔ جنس کے متعلق کسی فلسفے یا سائنس میں اسی لئے نشوونما نہیں ہوئی کہ ہر شخص یقین رکھتا ہے کہ وہ جنس کا علم رکھتا ہے۔ جنس پر کسی صحیفے کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ کسی کو بھی جنس کی سائنس مطلوب نہیں۔ یہ انسانیت کی سنگین غلطی ہے۔ جس روز ہم جنس کا جامع صحیفہ' سائنس یا کلی نظام تشکیل دینے پر قادر ہو گئے ہم نئی انسانیت کی تخلیق پر قادر ہو جائیں گے تب اس طرح کے مکروہ' بد صورت' لنگڑے لولے انسان پیدا نہیں ہوا کریں گے۔ بیمار' کمزور اور سپاٹ انسان کرہ ارض پر دکھائی بھی نہیں دیں گے۔ موجودہ نسل کو جو گناہ اور خطا کی پیداوار ہے' جدامجد بنانا لازمی نہیں ہے۔

لیکن ہم اس امر سے واقف نہیں ہیں! ہم تو فقط سوئچ آن آف کرنے کی عادت میں مبتلا ہیں اور سمجھتے ہیں کہ بجلی کا علم رکھتے ہیں۔ زندگی کے خاتمے پر بھی انسان نہیں جانتا کہ جنس کیا ہے؟ وہ صرف آن آف "کرنا جانتا ہے اور بس۔ ہم اس مغالطے میں کہ اس کے متعلق سب کچھ علم رکھتے ہیں کبھی گہرائی میں نہیں گئے' باطن میں نہیں گئے' اس کی تہہ رسائی کی کوشش کبھی نہیں کی یا اس میں دھیان نہیں کیا۔ جب ہر شخص سب کچھ جانتا ہے موضوع پر غوروفکر کی ضرورت ہی کہاں؟ اور اس کے ساتھ ہی میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ زندگی اور دنیا میں جنس سے زیادہ گہرا اسرار' گہرا رمز اور گہرا موضوع کوئی نہیں ہے۔

ابھی حال ہی میں ہم نے جوہر (ایٹم) دریافت کیا ہے اور دنیا میں حیرت ناک تبدیلی رونما ہو چکی ہے۔ لیکن جب ہم جنس کے جوہر کا کلی علم پانے میں کامیاب ہو گئے تو انسانیت دانش کے ایک نئے دور میں داخل ہو جائے گی۔ یہ پیش گوئی کرنا دشوار ہے کہ جب ہم زندگی کی تخلیق کی تکنیک اور عمل کی گہرائی ماپیں گے تو کن وسعتوں اور

رفعتوں کو پالیں گے۔ البتہ ایک بات یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ جنس کی توانائی' جنس کا رویہ نہایت پر اسرار 'گہرا' بیش قدر لیکن نفرت زدہ موضوع ہے جس کے بارے میں ہم مکمل تاریکی میں ہیں۔ ہم نے کبھی اس اہم مظہر پر توجہ نہیں دی۔ آدمی اختلاط کے عمل سے محض معمول سمجھ کر گزرتا ہے۔ وہ یہ تک نہیں جانتا کہ یہ ہے کیا؟

میں نے جب اپنی پہلی میٹنگ میں خالی پن' بے انائی اور خالی الذہنی کے متعلق گفتگو کی تھی تو کئی دوست متاثر نہیں ہوئے تھے۔ ایک دوست نے میری واپسی پر مجھے بتایا:"میں نے اس کے متعلق کبھی سوچا بھی نہیں۔ لیکن ایسا ہوتا ہے۔"

ایک خاتون آئیں اور مجھے بتانے لگیں:"مجھے ایسا تجربہ کبھی نہیں ہوا۔ جب آپ نے اس کے متعلق گفتگو کی تو میں نے یاد کیا کہ ذہن میں کبھی ٹھہراو اور طمانیت پیدا ہوئی ہو لیکن مجھے تو کبھی کوئی بے انائی یا اور کوئی عمیق تجربہ نہیں ہوا۔"

ایسا ممکن ہے کہ بہت سوں نے یوں نہ سوچا ہو۔ آیئے کچھ نکات پر زیادہ تفصیل کے ساتھ گفتگو ہو جائے۔

پہلے تو یہ کہ انسان کو اختلاط یا جنس کی سائنس کا کوئی پیش کی علم پیدائشی طور پر نہیں عطا ہوا۔ بہت کم لوگ ہیں' جو گزشتہ کئی جنموں کے تاثرات یاد رکھتے ہیں۔ اختلاط کے فن' ہم آہنگی کے عمل یا باطنی اسرار کا مکمل علم رکھتے ہیں۔ یہ وہ روحیں ہیں جو حقیقی تجرد کے درجے کو پا سکتی ہیں۔ وہ شخص جو اختلاط کی مکمل معنویت' مکمل مفاہیم کا ادراک رکھتا ہے اس کے نزدیک جنس بے مصرف ہو جاتی ہے۔ وہ اس سے گزر جاتا ہے۔ وہ اس سے ماورا ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسے لوگ اس کے متعلق تفصیل سے گفتگو نہیں کرتے۔ اور یہ روایت پنپ نہیں سکی کہ ان لوگوں سے جنس پر مباحثہ ہو جو اس سے ماورا ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ لوگ جو خالص تجرد کا مقام پا چکے ہیں اپنے گزشتہ جنموں اور زندگیوں کے متعلق بتا تو سکتے ہیں مگر بے انتہا کوششوں کے بعد۔ فقط ایک کامل مجرد ہی جنس اور اختلاط اور الوہیت کے متعلق کامل سچ کو منکشف کر سکتا ہے۔

ہوس پرست کسی لطافت کا ادراک نہیں کرتے اور لاعلمی کے سبب ہی سے ان کی زندگیاں موت تک جنسیت میں غرق رہتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے جانوروں میں اختلاط کا شیڈول ہوتا ہے۔ ان کا موسم ہوا کرتا ہے۔ وہ موڈ کا انتظار کرتے ہیں۔ لیکن انسان کا اس کے لئے کوئی وقت متعین نہیں ہے ------ کیوں؟ ممکن ہے جانور انسان کی نسبت جنس کی زیادہ گہری سطح تک رسائی پا چکے ہوں۔ وہ لوگ جنہوں نے اس سطح پر تحقیق کی ہے۔ جو گہرائی میں گئے ہیں' جنہوں نے زندگی کے بہت سے تجربات میں گہرا دھیان کیا ہے انہوں نے یہ ادراک مستنبط کیا ہے' یہ راہنما اصول تشکیل دیا ہے کہ اگر اختلاط ایک منٹ کے لئے واقع ہو تو انسان اگلے دن دوبارہ اس کی خواہش کرے گا۔ اگر یہ تین منٹ تک برقرار رہے تو انسان اگلے ایک ہفتے تک جنس کو یاد نہیں کرے گا۔ اگر یہ سات منٹ طویل ہو سکتا تو وہ جنس سے اتنا آزاد ہو جاتا کہ اگلے تین مہینے تک اس میں خواہش ہی نہ ابھرتی۔ لیکن اگر یہ تین گھنٹے تک محیط ہو سکے تو وہ ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جائے گا! وہ دوبارہ اس کی خواہش نہیں کرے گا ------ لیکن عموماً" انسان کے تجربہ کا عرصہ منٹ بھر کا ہی ہوتا ہے۔ تین گھنٹوں کا تو تصور کرنا بھی دشوار ہے۔ تاہم میں یہ اصرار کرتا ہوں کہ اگر ایک شخص اختلاط کی کیفیت ------ سمادھی کو' اتصال کو تین گھنٹوں تک برقرار رکھ سکتا ہے تو دخول کا ایک ہی فعل زندگی بھر کے لئے جنس سے نجات دلانے کے لئے کافی ہے۔ یہ ایسی طمانیت' ایسا تجربہ' ایسی مسرت عطا کر جاتا ہے جو کہ لافانی ہوتی ہے۔ ایک کامل اختلاط کے بعد انسان کے لئے حقیقی تجرد کے حصول میں کوئی رکاوٹ نہیں رہتی۔

زندگی بھر کے جنسی تجربات کے بعد بھی ہم اس اعلیٰ ترین الوہی مقام کے نزدیک بھی نہیں پہنچ سکتے۔ مغالطے یا واہمے کا سبب کیا ہے؟ ------ انسان پکی عمر کو پہنچتا ہے' زندگی کے اختتام کے قریب ترین آ جاتا ہے لیکن جنس کی شہوت سے' دخول کی تمنا سے کبھی نجات نہیں پاتا کیوں؟ ------ جواب یہ ہے کہ نہ تو وہ آگاہی رکھتا ہے اور نہ ہی جنس کی سائنس کے متعلق اسے بتایا جاتا ہے۔ وہ کبھی روشنی رکھنے والوں سے اس

کے متعلق مباحثہ کرتا ہے نہ اس پر کبھی غور فکر کرتا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ ایک منٹ کے تین گھنٹوں کے عرصے پر محیط ہونے کے متعلق تمہیں یقین نہ آئے۔ میں تمہیں چند مخصوص اور یاد رکھنے کے قابل نکات کے متعلق بتاؤں گا۔ اگر تم ان پر توجہ دو تو تجرد کا حصول سہل تر ہو جائے گا۔ سانس جتنی تیز ہو گا دخول کا عرصہ اتنا ہی مختصر ہو گا۔ اور سانس جتنا آہستہ اور پرسکون ہو گا اتنا ہی زیادہ اس امر کا امکان ہو گا کہ جنس سمادھی کا۔ شعور اعلیٰ تک۔ رسائی کا راستہ بن جائے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے "جنس سمادھی" ہی سے انسان کو "بے انائی" اور "عدم وقتی" کا ادراک ہوتا ہے۔ سانس دھیرے دھیرے لینا چاہیے۔ سانس کی دھیرج سے جنس ادراک کی گہری سے گہری پرتیں وا کرے گی۔

یاد رکھنے کی ایک اور بات یہ ہے کہ فعل کے دوران میں توجہ آنکھوں کے درمیان ہونی چاہیے جو کہ "آگنی چکرا" کا مقام ہے۔ اگر توجہ یہاں مرتکز ہو تو کلائمیکس کی شدت اور وقت تین گھنٹوں تک بڑھایا جا سکتا ہے۔ اور اختلاط کا ایسا عمل کسی شخص کی جڑیں تجرد کی مٹی میں پکی کر دیتا ہے۔ نہ صرف اس زندگی کے لئے بلکہ آئندہ کی زندگی کے لئے بھی۔

ایک خاتون لکھتی ہیں کہ ونوبا ایک مجرد ہے اور کیا میرے خیال میں اس نے سمادھی کو تجربہ نہیں کیا ہو گا؟ وہ مزید کہتی ہیں کہ میں بھی کنواری ہوں۔ میں نے شادی نہیں کی تو کیا میں سمادھی کا تجربہ نہیں کر سکتی؟ اگر وہ خاتون یہ کتاب پڑھتی ہیں تو میں انہیں بتانا چاہتا ہوں کہ نہ تو میں' نہ ونوبا اور نہ کوئی اور شخص بغیر حقیقی تجربے کے تجرد کے مقام اور اہمیت کا ادارک نہیں کر سکتا۔ وہ تجربہ جو ممکن ہے اس جنم میں ہو یا پچھلے جنم میں ہوا ہو۔ جو شخص اس جنم میں تجرد حاصل کرتا ہے تو اس کا سبب صرف اور محض گزشتہ جنم کا اختلاط کا گہرا تجربہ ہوتا ہے' کچھ اور نہیں۔ یہ اس کی واحد توضیح۔ اگر ایک آدمی گذشتہ جنم میں جنس کا عمیق تجربہ رکھتا ہے تو وہ اس زندگی میں جنس سے آزاد جنم لے گا۔ جنس اسے تصور میں بھی پریشان نہیں کرے گی۔ اس کے برعکس

وہ اس معاملے میں دوسروں کے رویے پر حیران ہو گا۔ وہ لوگوں کو جنس کے پیچھے پاگل دیکھ کر حیران ہو گا۔ اس معاملے سے ایک آدمی اور ایک عورت کے مابین فرق کے لئے خود پر زور دینا پڑے گا۔ اگر کوئی شخص تصور کرتا ہے کہ وہ بچپنے ہی میں بغیر کسی گذشتہ تجربے کے مجرد ہو سکتا ہے تو وہ کچھ نہیں ہو سکتا سوائے ایک نیوراتی کے۔ جو لوگ ہمیشہ تجرد کے روگ الاپتے رہتے ہیں' اس کی پابندی کا حکم دیتے ہیں وہ انسان کے انتشار کا سبب بنتے ہیں۔ اس سے اچھائی کبھی برآمد نہیں ہو سکتی۔ تجرد نافذ نہیں ہو سکتا۔ یہ فقط داخلی تجربے سے ابھرتا ہے۔ برہمچاریہ یعنی تجرد ایک متعین کمرے تجربے کا نتیجہ ہے اور وہ تجربہ جنس کا ہے۔ اگر کوئی شخص صرف ایک مرتبہ کامل کشف حاصل کر لے تو وہ باقی سارے جنموں کے لئے جنس سے رہائی پا جاتا ہے۔

اب تک میں نے اس کاملیت کے دو عوامل پر بحث کی ہے۔ ایک یہ کہ سانس اتنے دھیرے لیا جائے گویا سانس لیا ہی نہیں گیا دوسرے یہ کہ توجہ کو "آگنی چکرا" پر مرتکز کرو یعنی آنکھوں کے درمیانی مقام پر۔ جتنی زیادہ اعصابی مرکز پر توجہ ہو گی اتنا ہی زیادہ اختلاط عمیق ہو گا۔ اور عرصے کی طوالت کا سانس کی آہستگی سے راست نسبت ہے۔ تم کو پہلی بار محسوس ہو گا کہ ذہن کی طرف توجہ صرف اختلاط تک محدود نہیں۔ مقناطیسی کشش تو سمادھی کی ہے۔ اگر ہم ان رفعتوں تک بلند ہو سکتے ہیں' اگر ہم نور کا جلوہ کر سکتے ہیں تو اس سے راہ مستقبل روشن تر ہو جائے گی۔

ایک آدمی ایک بدبو سے بھرے ہوئے گندے شکستہ حال کمرے میں طویل عرصے سے پڑا ہے۔ کمرے کی دیوار شکستہ اور میل کے دھبوں سے اٹی ہوئی ہے۔ وہ اٹھتا ہے اور ایک کھڑکی کھولتا ہے۔ اب وہ آسمان پر چمکتا سورج دیکھ سکتا ہے' وہ ہوا میں آزادانہ اڑتے ہوئے پرندے دیکھ سکتا ہے۔ اور وہ شخص جو وسیع آسمان' سورج' چاند' اڑتے ہوئے پرندے دیکھ سکتا ہے۔ اور وہ شخص جو وسیع آسمان' سورج' چاند' اڑتے پرندوں' جھومتے درختوں اور خوشبو بکھیرتے پھولوں سے واقف ہو وہ کسی گندے' غلیظ اور تاریک کمرے میں ایک لمحے بھی نہیں ٹھہر سکتا۔ وہ کھلے میں بھاگ جائے گا۔ ایک

شخص جس نے جنس کا' سادھی کا جلوہ کیا ہو وہی اندر اور باہر اور آزادی اور قید کا فرق سمجھتا ہے۔ لیکن ایک لحاظ سے ہم تنگ دیواروں والی کوٹھڑی میں پیدا ہوئے ہیں' جو تاریک اور گندی ہے اور یہ انتہائی لازمی ہے کہ باہر کی دنیا کے وجود کا ادراک کیا جائے جس سے آدمی کو باہر کی طرف اڑان کی تحریک ملے۔ جو شخص کھڑکی نہ کھولے اور کونے میں آنکھیں بند کر کے کھڑا رہے اور کہے کہ وہ اس گندے گھر کو نہیں دیکھتا' وہ صورت حال کو ذرا سا بھی تبدیل نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ گندے گھر ہی میں رہے گا۔

ایک خود ساختہ مجرد بھی ایک عام آدمی ہی کی طرح جنس کی کوٹھڑی میں بند ہوتا ہے۔ اس میں اور تم میں فرق بس اتنا ہی ہے کہ وہ "آنکھ بند رجحان" پر عمل پیرا ہے اور تم "کشادہ چشمی کے رجحان" پر۔ جو کچھ تم جسمانی طور پر کرتے ہو وہی کچھ وہ ذہنی طور پر کرتا ہے۔ مزید یہ کہ جسمانی اعمال فطری ہوتے ہیں لیکن متبادل تصورات کج روی ہے۔ چنانچہ میں تم سے جنس سے معاندت برتنے نہیں بلکہ ہمدردی سے اسے سمجھنے کی کوشش کرنے پر اصرار کرتا ہوں۔ جنس کو ایک مقدس رتبہ دو!

ہم نے دو رہنما اصولوں پر بحث کی۔ تیسرا اہم اصول ہے "رسائی کا رجحان"۔ اختلاط کے وقت ہم خدا کے نزدیک تر ہوتے ہیں۔ وہاں خدا تخلیق کے عمل میں ہوتا ہے' ایک نئی زندگی کو جنم دیتا ہے لہٰذا ذہنی رجحان ایسا ہونا چاہیے گویا آدمی کسی معبد گرجے کو جا رہا ہو۔ کلائمکس میں ہم رفیع و عظیم کے بے حد قریب ہوتے ہیں۔ ہم ایک آلہ بن جاتے ہیں ایک نئی زندگی وجود پاتی ہے۔ ہم اس کے جد امجد بنتے ہیں کیسے؟........ ہم اختلاط میں خالق کے بے حد قریب ہوتے ہیں اور اس کا سایہ خود ہمیں خالق بنا دیتا ہے۔ اگر ہم جنس تک خالص ذہن اور احساس تقدس کے ساتھ رسائی پائیں تو خدا کی بصیرت سے متصف ہوتے ہیں۔ لیکن افسوس ہم جنس تک بڑی بے اعتنائی سے بلکہ ملامت کے رجحان کے ساتھ' ایذادہی کے احساس کے ساتھ رسائی پاتے ہیں اور وہاں خالق کی موجودگی کو محسوس کرنے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ آدمی کو جنس سے یوں تقدس کا برتاؤ کرنا چاہیے جیسے وہ معبد کو جاتے ہوئے کرتا ہے۔

بیوی کو الوہیت کا جزو سمجھنا چاہیے اور خاوند کا خدا کی طرح احترام ہونا چاہیے۔ آدمی کو غصے' حسد' برہمی' تفکرات اور آلودہ ذہن کے ساتھ جنس تک رسائی نہیں پانی چاہیے۔ لیکن عمومی طرز عمل اس کے برعکس ہے۔ کوئی شخص جتنا غصے' دل شکستگی اور اداسی میں ہو گا اتنا ہی زیادہ جنس کے لئے جائے گا۔

ایک خوش باش آدمی جنس کے لئے نہیں جاتا۔ ایک غمزدہ شخص جنس کے لئے جاتا ہے کیونکہ وہ اسے غم سے نجات کا موزوں راستہ سمجھتا ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ اگر تم تلخی' اشتعال' ملامت' پژمردگی یا ذہن میں اداسی کے ساتھ اس تک رسائی پاتے ہو تو تم وہ طمانیت و مسرت کبھی نہیں پا سکو گے جس کے لئے تمہاری روح سراپا تشنگی ہے۔ میں زور دے کر کہتا ہوں کہ جنس تک صرف خوشی سے' محبت سے معمور ہو کر اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مذہبی ہو کر رسائی پاؤ۔ صرف اسی وقت تم محسوس کرو گے کہ تمہارا دل خوشی' سکون اور تشکر سے لبریز ہے۔ ایسا آدمی جنس میں ترفع پا لیتا ہے۔ اس کا ایک بھرپور ادراک خواہ ایک بار ہی ہو جنس سے ہمیشہ کے لئے نجات دلانے کے لئے کافی ہے' جس سے رکاوٹ ٹوٹ جاتی ہے اور وہ سادھی کے محیط میں داخل ہو جاتا ہے۔ ماں کے رحم سے نمو پانے والا بچہ اس درخت کی طرح ستم زدہ ہوتا ہے جس کی جڑیں زمین سے اکھاڑ دی گئی ہوں۔ اس کا سارا وجود زمین سے جڑنے کے لئے فریاد کرتا ہے۔ زمین سے جڑے ہوئے وہ زندگی پاتا ہے' حیاتیت اور نشوونما پاتا ہے۔ جڑ سے اکھڑنے کے بعد وہ واپسی کے لئے دہائی دیتا ہے کیونکہ اکھڑنے کے بعد وہ زندگی سے کٹ جاتا ہے۔ ایک بچہ جب ماں کی کوکھ سے باہر آتا ہے تو وہ اپنی دنیا سے جدا ہو جاتا ہے۔ اب اس جہان مادری' اس شفیق سرچشمے سے دوبارہ اتصال کے لئے اس کی روح اور زندگی مضطرب ہو جاتی ہے۔ اسی آرزو کو محبت کی پیاس کا نام دیا جاتا ہے۔ محبت کا یہ کونسا معنی ہوا؟ ...... ہر شخص خواہش کرتا ہے محبت کے باہمی تبادلے کی' جیون دھارا سے دوبارہ اتصال کی آرزو کرتا ہے اور اس اتصال کا عمیق ترین تجربہ وہ جنسی عمل کی تکمیل میں' جفتی میں' مرد اور عورت کے ملاپ میں حاصل کرتا ہے۔

یہ حقیقی اتصال کا اولین تجربہ ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے مرد اور عورت کا ملاپ گہری معنویت کا حامل ہے۔ دو انسانوں کے ملاپ سے انا غائب ہو جاتی ہے۔ وہ شخص جو اس اتصال کا' محبت کی اس آرزو کا اور ایک ہونے کا حقیقی ادراک پاتا ہے وہی اتصال کی ایک دوسری قسم کا بھی ادراک پا سکتا ہے۔

ایک یوگی بھی وصل کرتا ہے' زاہد بھی وصل کرتا ہے' ولی بھی وصل کرتا ہے' مراقبہ کرنے والا بھی وصال میں ہوتا ہے اور وہ شخص بھی اتصال کرتا ہے جو وظیفہ زوجیت ادا کرتا ہے۔ ایک شخص دوسرے شخص کی معرفت خود کو پہچانتا ہے' اس میں جذب ہوتا ہے اور "واحد" ہو جاتا ہے۔ سادھی میں ایک شخص ساری کائنات سے وصال کرتا ہے اور اس سمیت واحد ہو جاتا ہے۔ جنس میں دو اشخاص کا وصل ہوتا ہے جبکہ سادھی میں ایک شخص پوری کائنات سے وصل کرتا اور کائنات کے سمیت واحد ہو جاتا ہے۔ دو اشخاص کا وصال لمحاتی ہوتا ہے جبکہ فرد اور کائنات کی یکتائی لافانی ہوتی ہے۔ وہ کوئی بھی دو اشخاص ہوں' فانی ہوتے ہیں لہٰذا ان کا وصال کیونکر لافانی ہو سکتا ہے۔ اور یہی تو المیہ ہے۔ محبت کی' ازدواج کی یہی تو تنگ دامنی ہے' جس سے ہم مل کر ایک ہونا چاہتے ہیں کبھی اس کے ساتھ لافانی وصل نہیں کر سکتے۔ ہم ایک لمحے کے لئے ہی مسرت میں وصل کرتے ہیں لیکن پھر ہمیں علیحدہ ہونا پڑتا ہے۔ یہ علیحدگی اذیت دہ ہوتی ہے۔ چنانچہ محبت کرنے والے ہمیشہ ایک مسلسل کیفیت الم میں رہتے ہیں۔

ایسا دکھائی دیتا ہے کہ شریک حیات اس المناک جدائی کی باعث ہے' جس کے ردعمل میں غصے کا آتش فشاں پھٹ پڑتا ہے۔ لیکن ایک عالم رائے دے گا کہ کوئی بھی دو شخص بنیادی طور پر دو مختلف شخصیتیں رکھتے ہیں' وہ عارضی طور پر ملنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن روحانی سطح پر ہمیشہ کے لئے ایک نہیں رہ سکتے۔ اور اس ناقابل تسکین جذبے سے دو محبت کرنے والوں کے مابین ایک کشمکش ابھرتی ہے۔ تم اس کی تحقیر کرنے لگتے ہو جس سے کہ تمہیں محبت ہوتی ہے۔ ایک تو' ایک جھگڑا' اجنبیت کا ایک احساس' ایک نفرت آہستہ آہستہ پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ تم تصور کر لیتے ہو کہ

"گویا وہ شخص جس سے تم یکجائی چاہتے ہو رضامند نہیں ہے چنانچہ ملاپ کامل نہیں ہوتا ہے۔

لیکن ایک فرد کو اس عدم تکمیل کا ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ انسان ایک محدود مخلوق ہے اور ان کا اتصال بھی محدود ہی ہو سکتا ہے' یہ کبھی دائمی نہیں ہو سکتا۔ ابدی یکتائی صرف خدا (براہمن) کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ وہ لوگ جو اختلاط کی لطافت ونزاکت کا ادراک رکھتے ہیں یہ تصور کر سکتے ہیں کہ اگر ایک فرد کے ساتھ لمحاتی یکتائی اس قدر سعادت ومسرت عطا کر سکتی ہے تو "ابدی" کے ساتھ ملاپ سے کیا کچھ ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔ تم مسرت کی ان رفعتوں کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ یہ نہایت عظیم انسان اور انتہائی لطیف ہوتی ہے' بیان سے ماورا' ایک ابدی سعادت!

فرض کرو ہم ایک چراغ کے سامنے بیٹھے ہوں اور اس چراغ اور سورج کی روشنی میں فرق تصور کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ یہ تقابل بے نتیجہ ہوگا۔ ایک چراغ تو بہت ہی معمولی شے ہے اور سورج بہت بڑی شے ہے' ہماری زمین سے "تقریباً" ساٹھ ہزار گنا بڑا ہے! اگرچہ یہ ہم سے کروڑوں میل دور ہے پھر بھی ہم کو حرارت دیتا ہے بلکہ ہمیں جھلسا دیتا ہے۔ ہم کیونکر سورج کے مقابلے میں چراغ کی روشنی کا فرق ماپ سکتے ہیں؟ فلکیاتی اعداد وشمار کچھ بھی ہوں لیکن ریاضیاتی طور پر فرق کا حساب ممکن ہے کیونکہ دونوں انسانی شعور کی دسترس میں ہیں۔ فرق کا پتا لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن اختلاط کی عارضی مسرت اور سادھی کی ابدی سعادت کے مابین فرق کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے۔ دو عارضی مخلوقات کا جنسی ملاپ لمحاتی ہوتا ہے جبکہ "آفاقی" سے اتصال میں کوئی فرد اپنے آپ کو یوں محو کرتا ہے جیسے سمندر میں قطرہ۔ دونوں کے تقابل کا کوئی ذریعہ' اس اتصال کی وسعت کی پیمائش کی کوئی اکائی نہیں ہے۔

کوئی شخص جب اس سعادت سے مس کرتا ہے تو کیا وہ جنس یا اختلاط کی آرزو کرے گا؟ کیا کوئی اس عارضی مسرت کے بارے میں سوچے گا جب وہ ابدی سمندر کو پا چکا ہو؟ اس "آفاقی" کی ایک جھلک انسان کو وہ بصیرت عطا کرتی کہ ہوس کی خوشی اس

کے سامنے بے معنی ہے' پاگل پن ہے۔ نیز موجودہ جذبہ جلد ہو جائے گا۔ یہ تو ایک نکاس' توانائی کا ضیاع اور غم کا سرچشمہ دکھائی دیتا ہے۔ جب یہ شعور طلوع ہوتا ہے تو ایک فرد تجرد کی منزل کے راستے پر چلنے کا خواہش مند ہوتا ہے ------ سمادھی اور جنس کے درمیان ایک طویل راستہ۔ سمادھی منزل ہے جبکہ جنس پہلا قدم ہے۔ میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ جو لوگ پہلے قدم کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں' جو پہلے قدم کو سنسر کر دیتے وہ دوسرے قدم تک نہیں پہنچ سکتے' ارتقا نہیں کر سکتے۔ پہلا قدم شعور' علم اور آگہی کے ساتھ اٹھانا ضروری ہے۔ لیکن خبردار رہو کہ یہ بذات خود کوئی اختتام نہیں ہے' یہ تو آغاز ہے۔ ہمیں ارتقا کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ قدم اٹھانے ہوں گے۔

لیکن انسانیت کا سب سے بڑا المیہ ہی پہلا قدم نہ اٹھانے کا رجحان ہے اور آرزو کرتا ہے آخری قدم تک رسائی کی۔ انسان پہلے زینے کو حقیر جانتا ہے اور سیڑھی کے آخری زینے کو گرفت کرنے کی خواہش رکھتا ہے۔ اسے چراغ کی روشنی کا تجربہ ہوتا نہیں اور سورج کی تابناکی کا مدعی ہوتا ہے۔ یہ تو ناممکن ہے۔

سورج کی روشنی کو گرفت کرنے کے لئے ہمیں ایک چھوٹے سے چراغ کی مدھم روشنی کی تحسین کرنی چاہیے' جو بہت تھوڑی دیر جلتا ہے' اور ہوا کے نرم جھونکے سے بجھ جاتا ہے۔ پہلا قدم درست طور پر اٹھانے سے آخری قدم کے لئے سورج تک پہنچنے کے لئے ایک آرزو' ایک خواہش' ایک بے قراری ابھرتی ہے۔ ہلکی موسیقی کی موزوں تحسین ابدی موسیقی کے لئے راہ بنا سکتی ہے۔ مدھم روشنی کا تجربہ ہمیں لامحدود روشنی تک لے جا سکتا ہے۔ قطرے کا علم سمندر کے علم کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ ایک جوہر کا علم ساری مادی قوتوں کے اسرار منکشف کر سکتا ہے۔

فطرت نے ہمیں ایک ننھا سا جوہر ---- جنس کا جوہر ---- عطا کیا ہے۔ لیکن ہم نے اسے نہیں پہچانا' ہم نے اسے مکمل طور پر تسلیم نہیں کیا۔ ایسا اس لئے ہے کہ نہ تو ہم میں اس کے احترام کا جذبہ ہے نہ ہی اس کو سمجھنے' جاننے اور تجربہ کرنے کے لئے

ہمارا ذہن صاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اس عمل کے ادراک سے دور ہیں جو ہمیں جنس سے سمادھی کی طرف لے جا سکتا ہے۔ جونہی انسان اس ماورائی مسرت کا احترام کرے گا' وہ معاشرے کے اعلیٰ درجے میں داخل ہو جائے گا۔

آدمی اور عورت دو الگ الگ سرے ہیں' بجلی کے مثبت اور منفی قطب ہیں۔ ان دونوں کے درست ملاپ سے ایک سرکٹ مکمل ہوتا ہے جو بجلی پیدا کرتا ہے' ایک ہم آہنگ موسیقی پیدا کرتا ہے۔ اس بجلی کی ایک براہ راست آگاہی ممکن ہے' اگر ہر کسی کو مکمل اور عمیق خود سپردگی کے ساتھ اختلاط لمبی مدت تک برقرار رہے۔ اگر یہ ایک گھنٹے تک محیط ہو تو ایک زیادہ چارج' بجلی کا ایک ہالہ خود ابھرے گا۔ اگر ہر ایک کے جسم کا کرنٹ مکمل طور پر محیط ہو جائے تو ہم تاریکی میں روشنی کی ایک شاہراہ دیکھ سکتے ہیں۔ ایک جوڑا جو اس مقناطیسی کرنٹ کا ذاتی تجربہ کرتا ہے' زندگی کا بھرپور جرعہ لے سکتا ہے۔

ہم اس منظر سے آشنا نہیں ہیں! ہمیں ایسی باتیں عجیب لگتی ہیں کیونکہ ہم اس میں یقین نہیں رکھتے جس کا ہم نے تجربہ نہیں کیا۔ یہ ہمارے عمومی تجربے کی اقلیم سے ماورا ہے۔ اگر ہم اس تجربے سے دوچار نہیں ہوئے تو ہمیں سوچنا اور دوبارہ کوشش کرنی چاہیے۔ زندگی کو دہرانا چاہیے' "خصوصاً" جنس کا باب تو الف' ب سے پڑھنا چاہیے۔ جنس کو مسرت کا محض آلہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے ہمیں ترفع بخشنا چاہیے۔ یہ ایک یوگی کا عمل ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ عیسیٰ یا مہاویر یا مہاتما بدھ کی پیدائش حادثاتی نہیں تھی۔ یہ دو اشخاص کے کامل وصل کا ثمر تھی۔ جتنا عمیق وصل اتنا بہتر ثمر' جتنا سطحی ملاپ اتنا برا ثمر۔ آج انسانیت کا معیار پست سے پست تر ہوتا جا رہا ہے۔ لوگ اس کے لئے اخلاقی زوال کو الزام دیتے ہیں۔ کچھ لوگ اس کو پہلے متعین و مقدر عہد انتشار "کلی یگ" کے اثرات قرار دیتے ہیں۔

یہ سب مفروضے جھوٹ اور بے حقیقت ہیں۔ یہ زوال جنس سے نظری اور عملی طور پر تنفی کے رجحان کی وجہ سے ہوا ہے۔ جنس اپنا حقیقی تقدس کھو چکی ہے' اپروچ

(رسائی) نے احساس تقدس کو داغ دار کر دیا ہے۔ یہ ایک میکانکی ذراوئے خواب میں بدل دی گئی ہے۔ اس رجحان سے تشدد ابھرتا ہے۔ یہ تادیر محبت کا تجربہ نہیں رہتی۔ یہ تادیر تقدس کی پرسکون ذریعہ نہیں رہتی۔ یہ ایک مراقباتی عمل نہیں رہی ہے۔ اس وجہ سے انسان تحت الثریٰ میں گرتا چلا جا رہا ہے۔ جو کام ہم کرتے ہیں اس کے نتیجے کا انحصار اس ذہنی کیفیت پر ہوتا ہے جس کے ساتھ ہم وہ کام سرانجام دیتے ہیں۔ اگر کوئی مجسمہ ساز نشے میں مجسمے بنائے تو کیا تم توقع کرتے ہو کہ وہ فن کا خوب صورت نمونہ تخلیق کر سکتا ہے؟ ایک رقاصہ رقص کرتی ہے۔ اگر وہ گبھراتی ہوئی، مشتعل یا غمزدہ ہو تو کیا تم اس سے شاندار کارکردگی (پرفارمنس) کی توقع کر سکتے ہو؟ اسی طرح جنس تک ہماری اپروچ ناشائستہ رہی ہے۔ یہ ہماری زندگی کا سب سے زیادہ نظر انداز شدہ معاملہ ہے۔ کیا یہ ایک بہت بڑی غلطی نہیں ہے کہ وہ مظہر جس پر زندگی کی ابدی تخلیق نو منحصر ہے وہی سب سے زیادہ نظرانداز ہوا ہے؟

شاید تم نہیں جانتے کہ اختلاط کے دوران میں کلائمکس ایک ایسا مقام تخلیق کرتا ہے جہاں وہ روح جو آسمان پر اڑان بھرتی ہے اس میں حلول کر جاتی ہے۔ اس کے ذریعے ایک زندگی تخلیق ہوتی ہے۔ تم صرف حالات تخلیق کرتے ہو۔ ایک مخصوص روح کے لئے جب وہ صورت حال جو لازمی، فائدہ مند اور موزوں ہوتی ہے، مکمل ہوتی ہے تو وہ روح جنم لیتی ہے۔ روح حالات کی کیفیت سے براہ راست جنم لیتی ہے۔

بچے کی نشوونما اگر غصے، اذیت، اضطراب وغیرہ میں ہوتی ہے تو عذاب پیدائش کے ساتھ ہی اس پر مسلط ہو جاتا ہے۔ کا معیار بہتر ہو سکتا ہے۔ روح اعلیٰ کی تخلیق کے لئے صورت حالات کو بھی کیفیاتی اعتبار سے اعلیٰ ہونا چاہیے۔ اس صورت میں بھی اعلیٰ روحیں پیدا ہو سکتی ہیں جو حتمی طور پر انسانیت کا معیار اونچا کریں گی۔ یہی وجہ ہے کہ میں یہ دلیل سے کہتا ہوں کہ جب انسان جنس کی سائنس اور فن سے آگاہ ہو گا تب وہ یکساں طور پر جوانوں اور بوڑھوں کو جنس کی مکمل تعلیم دینے کا اہل ہو گا۔ ہم ایسے حالات تخلیق کرنے کے قابل ہو جائیں گے جو اروبندو اور نطشے کا سپرمین (انسان

کامل) جنم دے سکیں گے۔ کیا ایسی نسل پیدا ہو سکتی ہے! کیا ایسی دنیا تخلیق ہو سکتی ہے!

جب تک یوں نہیں ہوتا اس وقت تک کوئی ارتقا نہیں ہو سکتا، دنیا میں امن نہیں ہو سکتا، جنگوں سے بچا نہیں جا سکتا، نفرت لاعلاج رہے گی، فحاشی کا قلع قمع نہیں ہو سکتا، برائیاں ختم نہیں ہو سکتیں، ہوس پرستی کو جڑ سے نہیں اکھاڑا جا سکتا، تاریکی کا نور نہیں ہو سکتی۔

تمام جدید آسائش اور ایجادات سے مدد لیتے ہوئے سیاست دان، عمرانیات دان اور مذہبی رہنما کوشش کر سکتے ہیں، جیسا کہ وہ کرتے رہے ہیں، جنگوں کو رونما ہونے سے روکا نہیں جا سکتا، تناؤ راحت میں بدل نہیں سکتا، تشدد اور حسد کم نہیں ہو سکتے۔ گزشتہ دس ہزار برسوں سے رسول، مسیحا اور رہنما جنگ سے بچنے، تشدد نہ کرنے اور غصے کا اظہار نہ کرنے کی تبلیغ کر رہے ہیں لیکن کوئی بھی نہیں سنتا۔ اس کے برعکس ہم نے اس انسان کو مصلوب کر دیا جو مذہب کی تعلیم دیتا تھا، عدم تشدد کی تبلیغ کرتا تھا، جس نے روحانی راستہ ہمیں دکھایا تھا۔ گاندھی جی نے ہمیں عدم تشدد پر عمل کرنے، روح کی طہارت اور ہم آہنگی کی تعلیم دی اور ہم نے اس کا صلہ گولیوں کی صورت میں دیا۔ ہم نے اس کی خدمات کا احسان یوں اتارا۔

اس امر کی بھی تصدیق کی جا سکتی ہے کہ انسانیت کے سابقہ یا موجودہ سارے پیغمبر ناکام رہے ہیں۔ زندگی کی جن مثالی اقدار کی انھوں نے تبلیغ کی وہ بے ثمر رہیں۔ ان میں سے کوئی بھی عملی اکسیر پیش نہیں کر سکا۔ تمام اعلیٰ تخیلاتی آدرش ناکام ہو چکے ہیں۔ جو سب سے عظیم تھے، جو سب سے درخشاں تھے وہ ناکام ہو چکے ہیں! وہ آئے، تبلیغ کی اور چلے گئے لیکن کرہ ارض پر انسان ہنوز تاریکی میں بھٹک رہا ہے اور دوزخ میں پڑا ہے۔ کیا اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ تعلیمات اور تبلیغ میں اساسی مغالطہ موجود ہے؟ چونکہ خشت اول کج ہے سو دیوار بھی ٹیڑھی ہی استوار ہوئی ہے اور اس کی درستی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

ایک انسان اس لئے یاسیت زدہ ہے کہ اس نے عالم یاس میں جنم لیا ہے۔ وہ ابتداہی سے یاسیت کے جرثومے لے کر آیا ہے' اس کی روح بیمار ہے۔ یہ بیماری' یہ رنج و الم کا سرطان اس کی روح کی گہرائیوں میں ہے۔ جس لمحے اس نے تصور کیا اس کا سارا وجود اسی میں ڈھل گیا۔ چنانچہ بدھا ناکام ہو گیا' مہاویر ناکام ہو گیا عیسیٰ ناکام ہو گیا' کرشنا ناکام ہو گیا ...... وہ سب کے سب ناکام ہو گئے جو انسان کو جنت کا باسی بنانا چاہتے تھے۔

ہم اسے تسلیم نہ کرتے ہوں تو الگ بات ہے لیکن انسان دن بدن زیادہ سے زیادہ "لاانسان" بنتا جا رہا ہے۔ عدم تشدد' رواداری' اور محبت کی بے پناہ تبلیغ کے باوجود ہم نے صرف سادہ خنجر سے کوبالٹ بم بنانے تک ہی ترقی کی ہے۔

میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ ہم نے پہلی جنگ عظیم میں تقریباً" تین کروڑ لوگوں کو ہلاک کر دیا اور جنگ بندی کے بعد ہم امن اور محبت کی باتیں کرنے لگے۔ بعد ازاں ہم نے امن اور بقائے باہم کے لئے مذاکرات شروع کر دیئے۔ برٹرینڈ رسل سے ونوبا تک سب یک آواز ہو کر کہتے ہیں کہ "امن قائم ہونا چاہیے۔ امن قائم ہونا چاہیے۔" اور ادھر ہم ہیں کہ تیسری عالمی جنگ کے لئے تیار ہیں ایسی جنگ جس کے مقابلے میں سابقہ جنگیں بچوں کا کھیل دکھائی دیں گی۔

کسی نے آئن سٹائن سے دریافت کیا کہ تیسری عالمی جنگ میں امکانی طور پر کیا ہو سکتا ہے؟ آئن سٹائن نے کہا تیسری عالمی جنگ کے بارے میں کچھ بتایا نہیں جا سکتا البتہ چوتھی عالمی جنگ کے متعلق بتایا جا سکتا ہے۔ سوال کنندہ نے حیرت سے کہا کہ جب آئن سٹائن تیسری عالمی جنگ کے متعلق کچھ بتا نہیں سکتا تو چوتھی عالمی جنگ کے بارے میں کیونکر کوئی پیش گوئی کر سکتا ہے۔ آئن سٹائن نے جواباً" کہا کہ ایک شے چوتھی عالمی جنگ کے متعلق یقینی ہے کہ کوئی چوتھی عالمی جنگ برپا نہیں ہو گی۔ وہ اس لئے کہ تیسری عالمی جنگ میں ایک انسان بھی زندہ نہیں بچے گا۔

یہ ہے ہماری انسانیت کی اخلاقی اور مذہبی تعلیمات کا ثمر' جس کی وجہ بھی یہیں

کہیں نہاں ہے اور اس پر نظرثانی جلد مطلوب ہے۔ جب تک ہم جنس کے عمل کو ہم آہنگ کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے' انسان کی جنس کو روحانی معنویت نہیں دیتے' انسان کو سادھی کا دروازہ جان کر اس کا احترام نہیں کرتے اس وقت تک ایک بہتر انسانیت وجود پذیر نہیں ہو سکتی۔ یہ امر یقینی ہے کہ آئندہ کی انسانیت موجودہ انسانیت سے بدتر ہو گی۔ کیونکہ آج کے گھٹیا بچے جنسی عمل سے گزرتے ہوئے اپنے سے بھی بدتر بچے پیدا کریں گے۔ کم از کم اتنی پیش گوئی تو کی جا سکتی ہے کہ آئندہ ہر نسل پست سے پست تر ہوتی جائے گی۔ ہم اس حالت کو پہنچ چکے ہیں کہ شاید مزید پستی کی گنجائش نہیں رہی۔ قریب قریب ساری دنیا ایک بہت بڑے پاگل خانے میں بدل چکی ہے۔ امریکی ماہرین نفسیات نے شماریاتی جائزوں سے اخذ کیا ہے کہ نیویارک کی آبادی کا صرف اٹھارہ فی صد ہی ذہنی طور پر صحت مند ہے۔ اگر صرف اٹھارہ فی صد لوگ ٹھیک ہیں تو باقی بیاسی فی صد لوگوں کی حالت کیا ہو گی؟ وہ تو تقریباً" بکھراؤ کی سطح پر ہوں گے۔ اگر تم ایک گوشے میں خاموش بیٹھ جاؤ اور اپنے اوپر خلوص کے ساتھ نظر دوڑاؤ تو تم اپنے اندر نہاں پاگل پن کی مقدار کو جان کر حیران ہو جاؤ گے۔ اگرچہ یہ ایک بالکل الگ معاملہ ہے کہ تم نے کیونکر اس کو دبایا اور قابو کیا ہوا ہے۔ معمولی سا جذباتی دھچکا لگا اور آدمی مکمل پاگل ہوا۔ یہ بھی امکان ہے کہ ایک صدی کے اندر اندر پوری دنیا ایک وسیع و عریض پاگل خانے میں تبدیل ہو جائے۔ اس کی طرف داری میں بہت سے فائدے ہوں گے' ہمیں پاگل پن کے علاج کی ضرورت نہیں ہو گی' نیوراتیوں کے علاج کے لئے کوئی ڈاکٹر نہیں ہو گا۔ کوئی آدمی تسلیم نہیں کرے گا کہ وہ پاگل ہے کیونکہ پاگل پن کی پہلی علامت ہی یہ ہوتی ہے کہ پاگل اپنے پاگل پن کو تسلیم نہیں کرتا۔ مذاق برطرف' یہ بیماری' یہ تاریکی ہمیشہ بڑھی ہے۔ جنس کے ترفع کے بغیر' جنسی اعمال کو الوہی درجہ دیے بغیر ایک نئی انسانیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ میں نے گزشتہ صفحات میں چند خاص تصورات پر زور دیا ہے۔ ایک نیا انسان ضرور پیدا ہونا چاہیے! انسان کی زندگی عروج کو پہنچے' آسمانوں کو چھوئے' چاند اور ستاروں کی طرح درخشاں

ہونے' رقص اور موسیقی میں پھولوں کی طرح شگفتہ ہونے کے لئے مضطرب ہے۔ انسان کی روح عروج کے لئے تشنہ و بے تاب ہے' لیکن اسے اندھا کر دیا گیا ہے' وہ ایک منحوس چکر میں کولہو کے بیل کی طرح گھومے جا رہا ہے' اس منحوس چکر کو توڑنے اور عروج پانے کا اہل نہیں رہا ہے۔

اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی صرف و محض ایک وجہ ہے اور وہ یہ کہ تخلیق تو کا عمل لایعنی بنا دیا گیا ہے۔ یہ پاگل پن سے معمور ہے کیونکہ ہم جنس کو سادھی کا دروازہ بنانے کے قابل نہیں ہو سکے۔ جنس کا ایک ہوش مندانہ عمل سادھی کا دروازہ کھول سکتا ہے۔ میں نے ان تین دنوں میں صرف چند عقائد کو واضح کیا ہے۔ اختتام پر میں ایک نکتہ دہراؤں گا اور آج کی گفتگو مکمل کر دوں گا۔

میں کہنا یہ چاہتا ہوں جنہوں نے ہمیں زندگی کی سچائیوں سے بھٹکایا ہے وہ انسانیت کے دشمن ہیں۔ جنہوں نے بتایا ہے کہ تم جنس یا مباشرت کی جزئیات نہیں جان سکتے' وہ انسان کے دشمن ہیں۔ انہوں نے ہمیں سوچنے' اظہار کرنے کی اجازت نہیں دی۔ ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم اس موضوع کی طرف اپنے رجحان کو ترقی نہ دے سکتے؟ ایک شخص جو کہتا ہے کہ جنس کا مذہب سے کوئی ربط نہیں وہ مکمل طور پر غلط ہے کیونکہ جنس کی توانائی ہی قلب ماہیت اور ترقی یافتہ صورت پانے کے بعد مذہب کی اقلیم میں داخل ہوتی ہے۔ قوت حیات کا ترفع انسان کو ان اقالیم میں پہنچا دیتا ہے جن کے بارے میں ہم زیادہ جانتے ہیں۔ یہ اس دنیا میں پہنچا دیتی ہے جہاں موت نہیں ہے' غم نہیں ہے۔ جہاں سوائے مسرت' خالص مسرت کے کچھ نہیں ہے۔

لیکن کون ایسی توانائی' ایسی قوت حیات کا حامل ہے جو اسے خوشی سے بھرپور اور سچ سے معمور شعور ــــــ ست' چت' آنند ــــــ کی اقلیم میں لے جا سکتی ہے۔ ہم اسے ضائع کرتے رہے ہیں۔ ہم ایسی بالٹیوں کے مانند ہیں جن کے پیندوں میں سوراخ ہیں۔ ہم ان بالٹیوں کو کنوئیں سے پانی نکالنے کے لئے استعمال کرتے ہیں جبکہ کھینچنے کے دوران میں پانی بہہ جاتا ہے۔ اس عمل کے دوران خاصا شور برپا ہوتا ہے۔ وہ محسوس

کرتے ہیں پانی اوپر آ رہا ہے لیکن سارا پانی تو کھینچنے کے دوران میں ہی بہہ جاتا ہے اور اختتام پر ہمارے ہاتھ خالی بالٹی ہی لگتی ہے۔ ہم ان کشتیوں کی طرح ہیں جن کے پیندوں میں سوراخ ہوتے ہیں۔ ہم محض ڈوبنے کے لئے چپو چلاتے ہیں۔ ایسی کشتیاں کبھی دوسرے ساحل پر نہیں پہنچتیں۔ بیچ منجدھار میں ڈوبنا ان کشتیوں کا مقدر ہوتا ہے۔ یہ سوراخ جنسی توانائی کی ناروا کجرویوں اور انخلا سے پیدا ہوتے ہیں۔ جو لوگ عریاں تصویروں کی نمائش کرتے ہیں' جو لوگ فحش کتابیں لکھتے ہیں' جو لوگ جنسیاتی فلمیں بناتے ہیں وہ اس انخلا کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ کجرویوں کے ان طریقوں کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہے جنہوں نے جنس کی جانکاری کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی ہیں اور انہی لوگوں کی وجہ سے ننگی تصویروں کی طلب پیدا ہوتی ہے' فحش کتابیں فروخت ہوتی ہیں' عریاں فلمیں بنائی جاتی ہیں اور ہم گندے اور لایعنی نتائج مختلف صورتوں میں ہر روز دیکھتے ہیں۔ اس کے ذمہ داروں میں راہب اور زاہد شامل ہیں۔ اگر گہری نگاہ ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ یہی لوگ فحاشی کے حقیقی ایڈورٹائزنگ ایجنٹ ہیں۔

ایک چھوٹی سی کہانی کے ساتھ میں اس گفتگو کو ختم کروں گا۔ ایک پادری نزدیک بستی کے چرچ میں عبادت کروانے کے لئے جا رہا تھا۔ وہ بروقت پہنچنے کے لئے بڑی تیز رفتاری سے راستہ طے کر رہا تھا۔ جھاڑیوں میں سے گزرتے ہوئے اس نے قریب کھڈ میں گرے ہوئے ایک زخمی آدمی کو دیکھا۔ ایک چاقو اس کے سینے میں دھنسا ہوا تھا اور خون بہہ رہا تھا۔ پادری نے اسے اٹھانے اور اس کی مرہم پٹی کرنے کا سوچا۔ لیکن دوسرا خیال آیا کہ اس طرح اسے وعظ و تبلیغ کے لئے چرچ پہنچنے میں تاخیر ہو جائے گی۔ اس روز اس نے وعظ کے لئے محبت کا موضوع منتخب کیا تھا۔ وعظ کے عنوان کے طور پر اس نے عیسیٰ کا مشہور مقولہ "محبت خدا ہے" چنا تھا۔ اس نے اس موضوع پر بلیغ گفتگو کرنا تھی اس لئے تیزی سے راستہ طے کرتے ہوئے وہ اہم نکات ذہن میں دہراتا جا رہا تھا۔ اس اثنا میں زخمی آدمی نے آنکھیں کھول دیں اور چلایا: "فادر! میں جانتا ہوں کہ آپ محبت کے موضوع پر وعظ کے لئے چرچ جا رہے ہیں۔ میں بھی وعظ سننے چرچ جا

رہا تھا مگر لٹیروں نے خنجر گھونپ کر یہاں پھینک دیا ہے۔ براہ مہربانی میری جان بچا لیجئے۔" پادری نے بے دلی سے یہ التجا سنی اور کہا: "مجھے جلدی ہے میں نہیں رک سکتا۔ میں گاؤں سے تمہارے لئے امداد بھجوا دوں گا۔" زخمی نے کہا: "ٹھیک ہے، تم جاؤ لیکن سنو اگر میں بچ گیا تو لوگوں کو بتاؤں گا کہ ایک آدمی سڑک کنارے مر رہا تھا اور اسے بچانے کی بجائے تم محبت پر وعظ کرنے چلے گئے۔ میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ مجھے نظرانداز مت کرو۔"

یہ بات سن کر پادری تھوڑا خوفزدہ ہو گیا۔ اس نے سوچا اگر یہ آدمی زندہ بچ جاتا ہے اور لوگوں سے واقعہ بیان کرتا ہے تو بستی کے لوگ کہیں گے کہ پادری کے سب کے سب وعظ ریاکارانہ ہوتے ہیں۔

پادری مرتے ہوئے آدمی کے لئے پریشان نہیں تھا بلکہ اسے لوگوں کی اپنے متعلق رائے کا ڈر تھا۔ طوعاً" کرہاً" وہ کھڈ میں اترا۔ جب وہ اس کے قریب پہنچا تو اسے آدمی کا چہرا واضح دکھائی دیا۔ وہ اسے کچھ شناسا لگا۔ اس نے پوچھا: "بیٹے! ایسا لگتا ہے میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔" زخمی نے کہا: "تم نے ضرور دیکھا ہو گا۔ میں شیطان ہوں اور پادریوں اور مذہبی رہنماؤں سے میرا پرانا تعلق ہے۔ اگر میں تمہارا نہیں تو بھلا کس کا شناسا ہوں گا؟"

پادری نے چرچ میں بھی شیطان کی تصویر دیکھ رکھی تھی لٰہذا وہ اسے خوب یاد رکھے ہوئے تھا۔ سو وہ یہ کہہ کر رک گیا: "میں تمہیں نہیں بچاؤں گا۔ بہتر یہی ہے کہ تم مر جاؤ۔ تم شیطان ہو۔ ہم ہمیشہ تمہارے مرنے کی دعا کرتے ہیں اور یہ اچھا ہے کہ تم مر رہے ہو۔ مجھے تمہیں بچانے کی کوشش کیوں کرنی چاہیے؟ تمہیں تو چھونا تک گناہ ہے۔ میں جا رہا ہوں۔"

شیطان ہنسنے لگا اور بولا: "سنو! جس دن میں مر گیا وہی دن تمہارے "کاروبار" کا بھی آخری دن ہو گا۔ تم تو میرے بغیر جی ہی نہیں سکتے۔ تم اس وقت تک ہو جب تک میں زندہ ہوں۔ میں تو تمہارے "پیشے" کی جڑ بنیاد ہوں۔ مجھے بچاؤ کیونکہ اگر میں

مر گیا تو تمام پادری، راہب، فادر بے جان بت بن جائیں گے۔ وہ سب ناپید ہو جائیں گے۔ ان کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔"

پادری نے اس بات پر سوچا اور محسوس کیا کہ یہ حقیقت ہے۔ اس نے فوراً" سے پیشتر مرتے ہوئے آدمی کو اپنے کندھوں پر اٹھایا اور کہا: "میرے پیارے شیطان! میں تمہیں فی الفور ہسپتال لے جا رہا ہوں۔ جلد ٹھیک ہو جاؤ اور خدا کے واسطے مت مرو۔ تم درست کہتے ہو کہ اگر تم مر گئے تو ہم لوگ "بے روزگار" ہو جائیں گے۔"

ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ پادری کی اساس شیطان ہے۔ اور یہ کہ شیطانی اعمال کے پشت پناہ پادری ہوتے ہیں۔ شیطان تو جنس کے استحصال میں سخت مصروف ہے۔ ہر رہبر کے پس پردہ جنس کا استحصال ہوتا ہے۔ ہم اس دھند کے پار دیکھ نہیں سکتے کہ پادری اس گڑبڑ کے ہمسائے ہیں۔ پادریوں کے جنس کی مذمت کرنے ہی سے تو جنس روز بروز زیادہ سے زیادہ پرکشش ہوتی جا رہی ہے۔ پادریوں کے جنس کو مسلسل رسوا کرنے کی وجہ سے انسان زیادہ ہوس پرست ہوتا جا رہا ہے۔ جتنا زیادہ پادری جنس کی نیست و نابود کرنے کی کوششیں کرتے ہیں، اتنا زیادہ یہ پراسرار ہوتی جاتی ہے، تجسس کو زیادہ ابھارتی ہے۔ اور انسان اس معاملے میں بے بس ہو چکا ہے، بالکل جنس کا غلام بن چکا ہے۔

اس سب ہی سے تمہں آنی چاہیے۔ ہم لاعلمی نہیں چاہتے ہیں۔ علم طاقت ہے اور جنس کا علم زیادہ بڑی طاقت ہے۔ جنس کے متعلق لاعلمی میں رہنا خطرناک ہے۔ یہ ممکن ہے کہ ہم چاند پر نہ پہنچ سکیں .... اور چاند پر پہنچنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ انسانیت چاند پر پہنچنے سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکتی۔ اس طرح دنیا کا خاتمہ نہیں ہو جائے گا اگر ہمیں بحرالکاہل کی اس گہرائی کا علم نہ ہو جہاں سورج کی روشنی بھی نہیں پہنچ سکتی۔ ان سب معلومات کے حصول سے انسانیت کو زیادہ فائدہ نہیں ہونے والا۔ یہ بھی کوئی بہت زیادہ اہم نہیں کہ ہم نے ایٹم کو پھاڑنا اور اس کی توانائی کا علم حاصل [illegible] ہے یا نہیں۔ لیکن یہ امر یقینی ہے اور انتہائی لازمی ہے کہ [illegible] ہے، اس

کو مکمل علم حاصل کیا جائے' اس کو سمجھا جائے اور اس سے ماورا ہوا جائے تاکہ ایک نیا انسان کامیابی سے تخلیق ہو سکے۔

میں نے گزشتہ چند صفحات میں کچھ باتیں کی ہیں۔ اب میں دوسرے سوالات کے جواب دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ جو سوال کیا گیا ہو اسے ایمانداری سے اور تحریری طور پر پیش کیا جانا چاہیے کیونکہ خدا اور روح کے متعلق پوچھنے کا رجحان یہاں درست نہیں ہو گا۔ یہ زندگی کا معاملہ ہے۔ سچ کو ہمیشہ دریافت کیا جا سکتا ہے۔ ہمیں اس کے متعلق جاننے کے لئے صرف سچی' ایماندارانہ اصولی تجسس کی ضرورت ہے اور بدقسمتی سے ہم میں اسی کا فقدان ہے۔

پانچواں باب

مجاز سے حقیقت تک

جان عزیز!

دوستوں نے بہت سے سوال پوچھے ہیں ---------- ایک دوست نے پوچھا ہے کہ میں نے جنس۔ شہوت کو موضوع سخن کیوں منتخب کیا؟ میں اس امر کی ضرور وضاحت کروں گا۔ ایک بڑی مارکیٹ ہے' تم چاہو تو اسے بمبئی مارکیٹ کہہ لو' وہاں ایک عوامی جلسہ ہوتا ہے۔ ایک پنڈت بھگت کبیر کے فلسفے پر تقریر کر رہا ہے۔ وہ ایک دوہا پڑھتا ہے اور پھر اس کی تشریح بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے:

کبیرا کھڑا بازار میں لئے لکوٹی ہاتھ
جو گھر بالے آپنا چلے ہمارے ساتھ

کبیر بازار کے وسط میں کھڑا ہے۔ وہ چھڑی ہلا رہا ہے اور لوگوں کو کہتا ہے کہ صرف وہ لوگ جو اپنے گھروں کو جلانے کا حوصلہ رکھتے ہوں' آئیں اور ہمارے ساتھ چلیں۔

میں نے دیکھا کہ لوگ اس کی دعوت سن کر خوش ہیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ لوگ جو کبیر کا یہ انتہائی گہرا پیغام اس سکون سے سن رہے ہیں ضرور اپنے گھروں کو بھی سچ کی تلاش میں جلانے کی جرات رکھتے ہوں گے۔ میں نے سوچا میں ایسے لوگوں سے دل کی گہرائیوں سے اور بے تکلفانہ گفتگو کرتا ہوں۔ لیکن درحقیقت ان میں سے کوئی

بھی اپنا گھر جلانے یا ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔ اگر کبیر یہ جان پاتا تو رنجیدہ خاطر ہوتا۔ ہم سب کبیر کے دوہے شوق سے سنتے ہیں لیکن ہم میں سے کوئی بھی اس وقت خوشی محسوس نہ کرتا جب تین سو سال پہلے ان کو تخلیق کیا تھا۔ میں خود اس فریب میں مبتلا ہوں جس نے کبیر اور عیسیٰ کو مسحور کر دیا تھا۔ بہرحال انسان ایک حیرت انگیز جانور ہے۔ ایک طرف وہ مرے ہوؤں کی باتیں سن کر محظوظ ہوتا ہے اور دوسری طرف زندوں کو ہلاک کرنے کی دھمکیاں دیتا ہے۔

میں سچ بول کر حیران ہوا ہوں۔ سچ کے بارے میں بات کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے وہ جھوٹ بے بنیاد ثابت کر دیئے جائیں جنہیں انسان سچ تسلیم کئے ہوتے ہیں۔ بہت سے عقائد جن کو ہم سچ جان کر ان پر ایمان لا چکے ہیں درحقیقت سچ نہیں ہیں۔ جب تک جھوٹ عیاں نہیں کر دیئے جاتے سچ کی جانب پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا جا سکتا۔ مجھے محبت کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے کہا گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ جب تک ہم جنس اور شہوت کے متعلق چند غلط مفروضوں سے دامن نہیں چھڑا لیتے مغالطہ آمیز یقین پختہ ہو جائیں تو ہم محبت کے متعلق جو کچھ بھی کہیں گے وہ رائیگاں جائے گا' سچ قرار نہیں پائے گا۔

محبت کو روشنی میں لانے کے لئے میں جنس اور شہوت پر پیشتر ازیں گفتگو کر چکا ہوں۔ میں نے کہا کہ جنس کی توانائی فی نفسہ محبت میں ڈھل سکتی ہے۔ اگر ایک آدمی کھاد خریدے جو فی نفسہ بدبو دار اور گندی ہوتی ہے اور اسے گھر کے نزدیک گلی میں ڈھیر کر دے تو کسی شخص کا نزدیک سے گزرنا بھی دوبھر ہو جائے گا۔ لیکن اگر کوئی شخص اپنے باغ میں بیجوں پر کھاد ڈالتا ہے تو بیج پروان چڑھیں گے' پھوٹیں گے اور پودے بن جائیں گے' جن پر پھول کھلیں گے اور ان کی خوشبو دور سے بلائے گی' راہ گیر اس سے حظ اندوز ہوں گے۔ لیکن تم نے شائد ہی سوچا ہو گا کہ پھولوں کی خوشبو سوائے کھاد کی بدبو کے کچھ بھی نہیں۔ کھاد کی بدبو بیج کے وسیلے سے بلند ہوئی اور پھولوں کی خوشبو بن گئی۔ بدبو خوشبو میں ڈھل سکتی ہے' جنس محبت میں ڈھل سکتی ہے۔ لیکن جو

شخص جنس سے نفرت کرتا ہے وہ کیونکر محبت سے معمور ہو سکتا ہے؟ جو شخص جنس کا دشمن ہو وہ کیونکر اس کی قلب ماہیت کر سکتا ہے؟ اسی لئے میں اس بات پر زور دیتا ہوں کہ جنس کو سمجھنا' شہوت کی جانکاری حاصل کرنا انتہائی لازمی ہے۔ پس میں نے ایک میٹنگ میں بتایا کہ جنس کی قلب ماہیت ضروری ہے۔ میں نے سوچا کہ جو لوگ اپنے گھروں کو جلانے کا سن کر محظوظ ہوتے ہیں وہ میری سادہ گفتگو سن کر خوش ہوں گے۔ افسوس میں غلطی پر تھا۔ جب اس روز میں نے گفتگو ختم کی تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ جتنے رہنما سٹیج پر تھے اور وہ دوست جنہوں نے میٹنگ کا اہتمام کیا تھا سب کے سب غائب ہو چکے تھے۔ جب میں سٹیج سے اترا تو ان میں سے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ شائد وہ اس ڈر سے گھروں کو چلے گئے کہ انھیں جلا نہ دیا جائے! یا بہت ممکن ہے وہ اپنے گھروں لگی آگ بجھانے کے لئے بھاگ پڑے ہوں! مرکزی منتظم بھی میرا شکریہ ادا کرنے کو وہاں موجود نہ تھا۔ وہاں جتنے سفید پوش' جتنے کھادی پوش تھے زیادہ دیر ڈائس پر نہ رہے۔ لیکچر مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ فرار ہو گئے تھے۔ یہ جو رہنما ہیں نا یہ ایک بہت کمزور نوع ہیں .... اور بھگوڑے بھی۔ کسی کے ان کے پیچھے لگنے سے پہلے وہ دوڑ کھڑے ہوتے ہیں۔

لیکن کچھ حوصلہ مند لوگ ضرور آئے' کچھ خوش طبع مرد اور عورتیں' کچھ بوڑھے' کچھ جوان۔ ان سب نے کہا کہ میں نے انہیں وہ باتیں بتائی ہیں جو اب تک کسی نے بھی انہیں نہیں بتائی تھیں۔ انھوں نے کہا ان کی تو آنکھیں کھل گئی ہیں' وہ اپنے اندر زیادہ روشنی محسوس کرتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ یہ احساس ممنونیت تھا۔ انھوں نے مجھ سے موضوع کی تکمیل کی درخواست کی۔ دیانت دار لوگ زندگی کو سمجھنے کے لئے تیار تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ مجھے موضوع کو وضاحت سے بیان کرنا چاہیے۔ میری بمبئی واپسی کی وجوہات میں سے یہ ایک وجہ تھی۔ جونہی میں بھون سے باہر آیا۔ ایک بڑا مجمع اکٹھا ہو گیا اور جو کچھ میں نے کہا تھا اس پر مبارکباد دینے لگا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ اگرچہ راہنما فرار ہو گئے ہیں تاہم لوگ

میرے ساتھ ہیں لهٰذا وہیں میں نے موضوع کو تفصیلاً" بیان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یوں میں نے اس موضوع کا انتخاب کیا تھا۔

ایک اور وجہ یہ تھی کہ جو لوگ فرار ہو گئے تھے انہوں نے لوگوں سے کہنا شروع کر دیا تھا کہ میں جیسی فحش باتیں کر رہا ہوں ان سے مذہب تباہ ہو جائے گا۔ وہ کہتے پھرتے تھے کہ میں ایسے معاملات زیرِ بحث لاتا ہوں کہ جن سے لوگ لادین ہو جائیں گے! لهٰذا میں نے سوچا کہ ان کو جواب دینے کے لئے بھی مجھے اپنا موقف ضرور واضح کرنا چاہیے۔ انھیں یہ بھی پتا چلنا چاہیے کہ جنس پر بحثیں سن کر لوگ لادین نہیں ہو جائیں گے بلکہ اس کے برعکس اب تک وہ لادین رہے ہیں کیونکہ انھیں جنس کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔ لاعلمی تمھیں لادین بنا سکتی ہے۔ علم تمھیں کبھی لادین نہیں بنائے گا۔ اور میں کہتا ہوں اگر علم لادینیت کا سبب ہو سکتا ہے تو بھی میں علم ہی کو ترجیح دیتا ہوں۔ لیکن بہرکیف معاملہ یوں نہیں ہے۔ علم دین ہے اور لاعلمی لادینیت ہے۔ جو مذہب علم کے نہ ہونے سے پنپتا ہے وہ کسی طور مذہب نہیں ہے۔ وہ لادینیت ہے۔ اور اس سے جلد نجات ہی بہتر ہے۔ جو روشنی روشنی سے حجاب کرے وہ روشنی ہی نہیں ہوتی۔ وہ روشنی کے بہروپ میں تاریکی ہوتی ہے۔ روشنی ہمیشہ روشنی کو بلاوا دیتی ہے۔ علم ہمیشہ علم کو خوش آمدید کہتا ہے۔ اور یاد رکھو! دین کچھ نہیں سوائے تلاش علم کے ...... خالص نور کے شعور کا دوسرا نام دین ہے۔

ضرر رساں ہمیشہ لاعلمی، تاریکی ہوتی ہے۔ اگر انسانیت بے قدر ہو جائے، اگر عمل کجروی وقوع پذیر ہو جائے، اگر شہوت کی وجہ سے انتشار پیدا ہو جائے، اگر جنس کی وجہ سے انسان نیوراتی ہو جائے تو قصور ان کا نہیں ہے جو جنس کے موضوع پر سوچتے اور دھیان دیتے ہیں، ذمہ دار تو اخلاقیات اور مذہب کے وہ راہنما اور مبلغ ہیں جو گزشتہ ہزاروں برس سے انسان کو لاعلمی کے لبادے میں لپیٹے ہوئے ہیں۔ اگر یہ جبر کرنے والے رائدین نہ ہوتے تو انسانیت بہت عرصہ پیشتر جنسیت سے نجات پا چکی ہوتی۔

جنس ایک معمول ہے لیکن جنسیت کی اختراع کا سبب یہ گرو ہیں! اس رکاوٹ پر

اس وقت تک غلبہ نہیں پایا جا سکتا جب تک جنس کے متعلق لاعلمی موجود ہے۔ میں کسی بھی سطح حیات پر لاعلمی کی حمایت نہیں کرتا۔ میں کسی بھی قیمت پر سچ کو خوش آمدید کہنے کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہوں۔

چنانچہ میں نے سوچا اگر سچ کی بھولی بھٹکی کرن لوگوں میں اتنا احتجاج پھیلا سکتی ہے تو مناسب یہ ہے کہ روشنی کے مکمل سرچشمے کو زیرِ بحث لایا جائے تاکہ یہ واضح ہو کہ علم انسان کو مذہبی بناتا ہے نہ کہ لادین۔ ان بنیادوں پر میں نے اس موضوع کا انتخاب کیا۔ اس کے بغیر میں اس موضوع کے انتخاب کرنے پر مائل نہ ہوتا۔ اس زاویے سے وہ لوگ میرے شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے بالواسطہ طور پر میرے لئے اس موضوع کے انتخاب کا موقع فراہم کیا جس پر میں نے سابقہ چار لیکچر پیش کئے ہیں۔ چنانچہ اگر تم اس موضوع کے لئے میرا شکریہ ادا کرنے کا سوچ رہے ہو تو براہ مہربانی ایسا مت کرو، اس کے لئے تمھیں ان لوگوں کا ممنون ہونا چاہیے جنہوں نے میرے بارے میں غیر متعلق باتیں پھیلائی ہیں۔ انہوں نے ہی مجھے اس موضوع کا انتخاب کرنے پر مجبور کیا۔

اب موضوع کی طرف باقاعدہ آتے ہیں سوال پوچھا گیا ہے کہ اگر محبت جنس کی قلب ماہیت ہے تو کیا ایک ماں کی اپنے بچے کے لئے محبت بھی جنس کی وجہ سے ہوتی ہے؟ کچھ دوسرے لوگوں نے بھی اس سے ملتے جلتے سوال پوچھے ہیں۔ ان کو سمجھنا ان کے جواب مہیا کرنا سب کے لئے سودمند ہو گا۔

اگر تم توجہ سے سنتے رہے ہو تو تمھیں یاد ہو گا میں نے تمھیں بتایا تھا کہ جنس کے تجربے میں بڑی گہرائیاں ہوتی ہیں جہاں بالعموم کوئی نہیں پہنچ پاتا۔ جنس کی تین سطحیں ہیں اور آج میں ان کے متعلق تمھیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ ان میں سے پہلی خام سطح ہے۔ ایک شخص طوائف کے پاس جاتا ہے۔ جو تجربہ اسے وہاں حاصل ہوتا ہے وہ زیادہ گہرا نہیں ہوتا، صرف جسمانی ہوتا ہے۔ ایک طوائف جسم تو بیچ سکتی ہے لیکن دل نہیں بیچ سکتی۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ روح کسی طور بھی فروخت نہیں ہو سکتی، جسم تو مل

سکتے ہیں جیسے زنا میں ملتے ہیں۔ زنا میں دل یا روح کا کوئی ملاپ نہیں ہوتا۔ زنا صرف جسمانی سطح پر کیا جا سکتا ہے لیکن روح سے زنا کا کوئی طریقہ نہیں۔ زنا کا تجربہ جسمانی ہوتا ہے۔ جنس کا ابتدائی تجربہ جسمانی سطح پر ہوتا ہے لیکن وہ لوگ جو اسی سطح پر ٹھہر جاتے ہیں وہ جنس کا کامل تجربہ حاصل نہیں کر پاتے۔ وہ ان گہرائیوں سے ناآشنا رہتے ہیں جن کا میں ذکر کیا کرتا ہوں۔ آج لوگوں کی اکثریت جسمانی سطح پر ہی رک گئی ہے۔

اس حوالے سے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ان ملکوں میں جہاں شادیاں بغیر محبت کے ہوتی ہیں، جنس جسمانی سطح پر جلد ہو جاتی ہے' یہ اس سے اوپر ترقی نہیں کر سکتی۔ ان کی شادیاں دو جسموں کی شادیاں تو ہو سکتی ہیں دو روحوں کی نہیں۔ لیکن محبت تو فقط دو روحوں کے درمیان ہی ہو سکتی ہے۔ شادیاں زیادہ گہری معنویت حاصل کر سکتی ہیں اگر محبت کے لئے ہوں۔ دوسری طرف اگر شادیاں پنڈتوں اور نجومیوں کے حساب کتاب کی وساطت سے ہوں یا ذات پات اور عقیدے کو مد نظر رکھ کر ہوں یا پیسے کے لئے ہوں تو جسمانی سطح سے زیادہ گہرائی میں نہیں جا سکتیں۔

اس سسٹم کا ایک فائدہ ضرور ہے' وہ ان معنوں میں کہ جسم ذہن سے زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ چنانچہ اس معاشرے میں جہاں جسم شادی کی بنیاد ہوتا ہے' شادی کا نظام زیادہ مضبوط ہو گا۔ یہ تادیر رہے گا کیونکہ جسم کوئی غیر مضبوط شے نہیں ہے۔ جسم ایک تقریباً" مستقل عامل ہے۔ اس میں ہونے والی تبدیلی اس قدر آہستہ ہوتی ہے کہ بمشکل محسوس کی جا سکتی ہے۔ جسم مستقل ہوتا ہے اور وہ معاشرے جو شادی کے ادارے کو مضبوط رکھنا ضروری سمجھتے ہیں وہاں یک زوجی کی پابندی کی جاتی ہے' تبدیلی کا کوئی امکان نہیں چھوڑا جاتا۔ محبت کو موقوف کرنا پڑتا ہے' انھیں محبت کو ترک کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ محبت کا مقام دل ہے اور دل جسم کی طرح مستحکم نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس ان معاشروں میں طلاق ناگزیر ہو گی جہاں محبت شادی کی اساس ہوتی ہے۔ ان معاشروں میں شادیاں ناپائیدار ہوں گی۔ چونکہ محبت تغیر پذیر ہوتی ہے لہذا شادی مستحکم نہیں ہو سکتی۔ دل سیماب صفت ہے اور جسم مستقل ہے' مضبوط

ہے۔ فرض کرو تمھارے آنگن میں پتھر پڑا ہو' یہ شام کو بھی وہیں ہو گا جہاں صبح کو پڑا ہوا تھا۔ اس کے برعکس پھول صبح کے وقت کھلتا ہے مگر شام کو مرجھا کر جھڑ جاتا ہے۔ پتھر ایک بے جان شے ہے جو کچھ یہ صبح کو تھا وہی یہ شام کو بھی ہو گا۔ جو شادیاں جسمانی سطح پر ہوتی ہیں وہ مستحکم ہوتی ہیں لیکن پتھروں سے مختلف نہیں ہوتیں۔ ایسا کچھ معاشرے کے لئے تو فائدہ مند ہے لیکن فرد کے لئے مضرت رساں ہے۔

اس نوع کی شادیوں میں میاں بیوی کا ملاپ گہری جہتوں کو مس نہیں کرتا۔ جنس ایک محض میکانکی معمول بن جاتی ہے۔ جنسی کثرت سے دہرائے جانے پر پتھر ہو جاتی ہے۔ اس معمول کا نتیجہ کچھ نہیں ہو سکتا سوائے اس کے فریقین آخرکار "اندھے" ہو کر رہ جائیں۔

بغیر محبت کی شادی اور طوائف کے ہاں جانے میں کوئی معمولی سا بھی فرق نہیں ہے۔ طوائف کے پاس تم ایک دن کے لئے جاتے ہو جبکہ بیوی کو عمر بھر کے لئے خرید لاتے ہو۔ بس یہی فرق دونوں میں ہے۔ محبت نہ ہو تو شادی خریداری ہی ہو گی نا! خواہ ایک دن کے لئے ہو خواہ عمر بھر کے لئے! بہرکیف روزانہ کے ربط سے ایک طرح کا رشتہ ضرور وجود میں آجاتا ہے ...... اور ہم اسی کو محبت کا نام دے دیتے ہیں۔ محبت یہ تو نہیں ہوتی محبت اور ہی کچھ ہے۔ یہ شادی جسمانی ہے اور نتیجتاً" رشتہ بھی جسمانی سے زیادہ عمیق نہیں ہو سکتا۔

یہ تو تھیں اولین سطح کی باتیں' دوسری سطح ہوتی ہے نفسیاتی ---- دل کی' ذہن کی سطح۔ وتسیائن سے لے کر کوکا پنڈت تک جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں وہ جسم کی سطح سے آگے نہیں گئیں۔ جو لوگ محبت کرتے ہوں اور پھر شادی کریں ان کی شادیاں جسمانی سطح پر شادی کرنے والوں کی نسبت زیادہ گہرائی میں جاتی ہیں۔ یہ دل تک پہنچتی ہیں۔ گہرائی نفسیاتی ہوتی ہے لیکن وہ بھی روزانہ کی اکتا دینے والی یکسانیت کی وجہ سے جسمانی سطح پر لوٹ آتے ہیں۔ گزشتہ دو سو برسوں میں مغرب میں شادی کا جو ادارہ تشکیل پا گیا ہے وہ اسی سطح کا ہے۔ اور اسی وجہ سے معاشرے بے ربط اور ٹوٹے

ہوئے ہیں' اسی وجہ سے تم ذہن اور جذبات پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ آج وہ کچھ مانگتا ہے کل اور کچھ مانگے گا۔ صبح کو کچھ مانگے گا اور شام میں کچھ اور۔ اب جو کچھ محسوس کرتا ہے' اس سے یکسر مختلف ہو گا جو چند لمحے پیشتر محسوس کرتا تھا۔

شاید تم نے سنا ہو کہ بائرن نے شادی سے پہلے ساٹھ یا ستر عورتوں سے روابط قائم کیے تھے۔ وہ شادی کے بعد بیوی کی باہوں میں باہیں ڈالے چرچ گیا۔ گھنٹیاں بج رہی تھیں' شمعیں چرچ میں اجالا بکھیر رہی تھیں۔ مہمان ایک ایک کر کے اسے مبارک دے رہے تھے۔ کچھ لوگ رخصت ہو رہے تھے' وہ بھی اپنی بیوی کو بگھی میں سوار کرا رہا تھا کہ اس کی نظر قریب سے گزرتی ہوئی ایک حسینہ پر پڑی۔ وہ اس کے حسن سے مسحور ہو کر رہ گیا۔ حالانکہ تازہ تازہ شادی ہوئی تھی' وہ ایک لمحے کو تو بیوی کو بھول ہی گیا۔ خواہی نخواہی وہ بگھی میں بیٹھا۔ لیکن یقیناً' وہ ایک بہت دیانت دار آدمی رہا ہو گا کیونکہ اس نے نئی نویلی بیوی کو بتایا: "کیا تم نے کچھ محسوس کیا؟ ابھی ابھی ایک انوکھی بات ہوئی ہے۔ گزشتہ کل تک' جب میری تم سے شادی نہیں ہوئی تھی' میں پریشان تھا کہ میں تمھیں جیتنے میں کامیاب ہوؤں گا یا نہیں۔ میرے ذہن میں واحد عورت تم تھیں۔ لیکن اب جبکہ میں تم سے شادی کر چکا ہوں' تمھیں اپنا بنا چکا ہوں' ابھی ہم سیڑھیاں اتر رہے تھے تو میں نے سڑک کے اس طرف سے گزرتی ہوئی ایک خوبصورت دوشیزہ کو دیکھا' ایک لمحے کو تو میں تمھیں بھول ہی گیا' میرے ذہن نے اس کا تعاقب شروع کر دیا اور ایک خیال اٹھا کہ کیا میں اس دوشیزہ کو حاصل کر سکتا ہوں؟"

آہ! ذہن ہمیشہ تغیر پذیر رہتا ہے! لہٰذا جو لوگ خاندانی زندگی کو مستحکم کرنا چاہتے ہوں انھیں نفسیاتی سطح پانے والی شادی نہیں کرنی چاہیے۔ انھیں صرف جسمانی سطح پر ٹھہرنا ہو گا۔ شادی کرو' محبت مت کرو۔ لیکن اگر شادی کے بعد تمھیں محبت ہو جاتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ جیسا چلے چلنے دو۔ استحکام جسمانی سطح پر ممکن ہے لیکن نفسیاتی سطح پر یہ دشوار ہے۔ جنس کا تجربہ ذہنی سطح پر لطیف اور عمیق ہوتا ہے۔ اور اسی لئے مغرب میں یہ تجربہ مشرق سے زیادہ عمیق ہے۔ مغرب کے نفسیات دان فرائیڈ سے لے کر

یونگ تک نے جنس کی اسی دوسری سطح نفسیاتی سطح کے بارے میں کتابیں لکھی ہیں۔

لیکن جس نوع کی جنس کے متعلق میں بات کر رہا ہوں وہ تیسری سطح کی جنس ہے' جس کا اب تک نہ تو مغرب میں اور نہ مشرق میں ادراک کیا گیا ہے۔ یہ تیسری سطح روحانی ہے۔ جسمانی سطح پر ایک نوع کا استحکام ہوتا ہے کیونکہ جسم غیر متغیر اور جامد ہوتا ہے۔ ایک طرح کا استحکام روحانی سطح پر بھی ہوتا ہے کیونکہ اس سطح پر بھی تغیر نہیں ہوا کرتا' ہر شے پر سکون اور ابدی ہوتی ہے۔ اور ان دو سطحوں کے درمیان میں نفسیاتی سطح ہے جو پارے کی طرح متغیر ہے۔ مغرب اسی سطح پر تجربہ کر رہا ہے لہٰذا وہاں شادیاں ٹوٹتی رہتی ہیں' خاندان بکھرتے رہتے ہیں۔ جو شادی ذہن سے بنٹ کر ہو وہ اور ایک مستحکم خاندان ہم آہنگ نہیں ہوا کرتے۔ فی الحال طلاق کے رجحان میں دو سال کا وقفہ ہوتا ہے۔ یہ محض دو گھنٹے کے دورانیے تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ ذہن تو ایک گھنٹے کے دوران میں بھی متغیر ہو سکتا ہے! مغرب کا معاشرہ بے ربطی کا شکار ہے۔ اس کے مقابلے میں مشرق کا معاشرہ مستحکم رہا ہے تاہم مشرق بھی جنس کی لطیف اور ترفع یافتہ گہرائی سے آگاہی پانے کے قابل نہیں ہو سکا ہے۔

خاوند اور بیوی ہوں یا کوئی سے بھی دو افراد ہوں اگر وہ زندگی میں ایک دفعہ ہی سہی روحانی سطح پر ملاپ کرتے ہیں تو ایسا محسوس کرتے ہیں۔ گویا وہ آنے والے لامختتم جنموں تک کے لئے ایک ہوتے ہیں۔ اس سطح پر ملاپ میں کسی نوع کا سیال پن نہیں ہوتا۔ پائیداری اور خالص مسرت اس کا اثاثہ ہوتے ہیں۔

جس نوع کی جنس کا ذکر میں کر رہا ہوں وہ روحانیت اساس جنس - شہوت ہے۔ میں واضح کر رہا ہوں کہ تم محسوس کرو گے کہ ماں کی اپنے بیٹے کے لئے محبت روحانی محبت کا جزو ہے۔ ماں اور بیٹے میں کون سا جنسی رشتہ ممکن ہے؟ اس کو مکمل طور پر سمجھنے کے لئے ہمیں جنس کے بہت سے دوسرے پہلوؤں اور خاوند' بیوی اور بچے کے باہمی رشتے کا تجزیہ کرنا ہو گا۔

لیکن جیسا کہ میں نے تمھیں بتایا ہے ایک آدمی اور ایک عورت' ایک خاوند اور

ایک بیوی ایک بار ملاپ کرتے ہیں' ان کی روحیں بھی اس دوران میں ملتی ہیں' ایک ہوتی ہیں لیکن محض ایک لمحے کے لئے جبکہ بچہ ماں کی کوکھ میں نو ماہ تک رہتا ہے اور ان نو ماہ میں وہ ماں کے وجود کی اکائی کا حصہ ہوتا ہے۔ خاوند بھی وجود ھی کی سطح پر ملاپ کرتا ہے۔ وہ وجود کی حد تک' ہستی کے ہالے ہی میں ملاپ کرتا ہے لیکن محض لمحے بھر کے لئے اور پھر وہ الگ ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا وہ تعلق جو ماں کا بچے سے ہوتا ہے وہ تعلق خاوند سے ممکن ہی نہیں ہے ------- یہ ممکن ہو بھی نہیں سکتا۔ بچہ ماں کی سانسوں میں سانس لیتا ہے' ماں کے دل میں اس کی دھڑکنیں سمائی ہوتی ہیں' اس کا اور ماں کا خون اور زندگی ایک ہوتے ہیں' وہ کوئی منفرد وجود نہیں رکھتا' وہ تو اس وقت اپنی ماں ہی کا ایک جزو ہوتا ہے۔ کوئی خاوند بچے کی ماں کی طرح ماں کی تکمیل نہیں کر سکتا۔ کوئی خاوند بیٹے کی طرح ماں جیسے عمیق رشتے کا احساس کبھی نہیں دے سکتا۔

ماں بنے بغیر کسی بیوی کی نشوونما مکمل نہیں ہو سکتی۔ ماں بنے بغیر اپنی شخصیت کی مکمل تابندگی اور اس حسن کامل کی شگفتگی ممکن نہیں ہو سکتی۔ ماں بنے بغیر' ایک بچے سے گہرے روحانی رشتے کے بغیر کوئی عورت مطمئن نہیں ہو سکتی۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذہن نشین کر لو کہ ماں بنتے ہی عورت کی جنس میں دلچسپی خود بخود کم ہو جاتی ہے۔ جب اس کے وجود میں نو ماہ تک ایک زندگی دھڑکتی ہے تو وہ ممتا کے گہرے نشے میں ہوتی ہے۔ تب اسے جنس میں زیادہ دلکشی محسوس نہیں ہوتی۔ خاوند ان دنوں اس کی بے اعتنائی سے بوکھلایا ہوا ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ باپ بننا اس کے جنسی رجحان میں کوئی تبدیلی برپا نہیں کرتا۔ بچے کی پیدائش کے عمل سے اس کا تو کوئی گہرا تعلق نہیں ہوتا۔ نئی جنم لینے والی زندگی کے ساتھ وہ کوئی روحانی یکتائی نہیں رکھتا۔ لیکن ماں بننے سے ایک عورت میں جوہری تغیر برپا ہوتا ہے۔ باپ ایک سماجی ادارہ ہے۔ بچہ باپ کے بغیر پروان چڑھ سکتا ہے لیکن ماں کے ساتھ اس کا رشتہ گہرا اور اٹوٹ ہوتا ہے۔

ایک بچے کی پیدائش کے فوری بعد عورت میں ایک نوع کی روحانی حرارت ابھرتی

ہے۔ اگر تم ایک ایسی عورت کو دیکھو جو ماں نہ بنی ہو اور ایک ایسی عورت کو دیکھو جو ماں بن چکی ہو تو تمھیں یہ فرق واضح محسوس ہو گا کہ ان میں سے ایک نہایت تاباں اور باثروت دکھائی دے گی۔ ایک ماں میں تمھیں ایک نور دکھائی دے گا' ایک طمانیت ملے گی' اس دریا کی طرح کی طمانیت جو میدانوں میں بہہ رہا ہو۔ اور اس عورت میں جو ماں نہ بنی ہو تمھیں ایک سیال پن ملے گا' اس ندی کی طرح جو ہنوز پہاڑوں میں گزر رہی ہو' جو شور مچاتی' چنگھارتی ہوئی میدانوں کی طرف تیزی سے رواں ہوتی ہے۔ وہ ماں بنتے ہی خاموش' پرسکون اور مطمئن ہو جاتی ہے۔

اسی سلسلے میں میں کہنا چاہتا ہوں کہ جو عورت جنس کے پیچھے پاگل ہوئی جا رہی ہو' جیسا کہ مغرب میں آج کل ہو رہا ہے' وہ ماں نہیں بننا چاہتی کیونکہ ماں بنتے ہی جنس کی کشش یکدم کافور ہو جاتی ہے۔ ایک مغربی عورت ماں بننا اس لئے پسند نہیں کرتی کہ ماں بنتے ہی جنس میں دلکشی کھو بیٹھے گی۔ جنس میں اس کا غلطان ہونا اسی وقت تک برقرار رہتا ہے جب تک وہ ماں نہیں بن جاتی۔ بہت سے مغربی ملکوں کی حکومتیں اس مسئلے کی وجہ سے پریشان ہیں کہ اگر یہ صورت حال جاری رہتی ہے تو ان کی آبادیوں کے حجم کا کیا بنے گا! ہم آبادی میں اضافے سے پریشان ہیں اور مغرب کے بہت سے ملک آبادی میں کمی کی وجہ سے متفکر ہیں۔ یہ کمی اس لئے بھی ہو رہی ہے کہ ماں بننے سے جنس میں دلچسپی گھٹ جاتی ہے!! فیملی پلاننگ کا کوئی قانون تو جبراً" نافذ کیا جا سکتا ہے لیکن کسی عورت کو ماں بننے کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

مغربی ملکوں کا مسئلہ ہمارے آبادی کے مسئلے سے زیادہ پیچیدہ ہے۔ ہم قانون یا طاقت کے ذریعے اضافہ آبادی کو تو روک سکتے ہیں لیکن ہم قانون سازی سے آبادی میں اضافہ نہیں کروا سکتے۔ اگلے دو سو برس میں مغرب میں یہ عقدہ مزید گمبھیر ہو سکتا ہے کیونکہ مشرق میں آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور ساری دنیا پر یکبارگی غالب آسکتی ہے کہ مغرب کی افرادی قوت وقت گزرنے کے ساتھ ختم ہو جائے گی۔ انھیں عورتوں کو دوبارہ ماں بننے کے لئے آمادہ کرنا پڑے گا۔ کچھ ماہرین تو کم عمری کی شادیوں کا

مشورہ دینے لگے ہیں' ورنہ بڑے ہو کر تو عورت ماں بننے میں دلچسپی ہی نہیں لیتی وہ تو جنسی حظ اندوزی میں زیادہ دلچسپی لیتی ہے۔ ماہرین نفسیات اس سادہ وجہ سے نوجوانوں کی شادی کی وکالت کرتے ہیں کہ اس صورت میں ماں بننے سے پہلے عورت میں کوئی ایسے ویسے خیالات نہیں پیدا ہوتے۔ مشرق میں کم عمری کی شادیوں کی پس پردہ وجوہات میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے۔ جب عورت جوان اور باشعور ہو اور جنس کا لطف اٹھا چکی ہو وہ ماں بننا پسند نہیں کرے گی۔ جنس کے لئے یہ بے پناہ کشش کی ذہنیت اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک انھیں علم نہ ہو کہ ماں بن کر وہ سب کیا حاصل کر سکتی ہیں۔ جس کا ادراک انھیں ماں بننے ہی سے ہو سکتا ہے۔ اور حقیقتاً ماں بنے بغیر اس کی جھلک پانا بھی ممکن نہیں ہے۔

ایک عورت ماں بننے کے بعد اتنی مطمئن کیوں ہو جاتی ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بچے کے ساتھ ایک انوٹ الوہی جنسی تجربہ رکھتی ہے۔ ایک عورت بچے کے لئے جان دے سکتی ہے لیکن اپنے بچے کی جان لینے کا تصور تک نہیں کر سکتی۔ ایک بیوی خاوند کو قتل کر سکتی ہے' اور ایسا متعدد بار ہوا ہے' اگر وہ ایسا نہیں کرتی تو گھر میں ایسے حالات پیدا کر دیتی ہے کہ جو خاوند کے لئے قتل ہونے کے مترادف ہوتے ہیں۔ لیکن بچے کے لئے وہ ایسی چیزوں کا تو کبھی تصور بھی نہیں کرے گی۔ اس سے متبادر ہوا کہ ان کا رشتہ بہت گہرا ہے۔

یہاں میں یہ بھی بیان کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنے خاوند کے ساتھ ایسی وسعت رکھنے والا گہرا رشتہ قائم کرتی ہے تو خاوند بھی اس کے لئے بچہ ہو جاتا ہے۔ تب وہ مزید اس کا خاوند نہیں رہتا۔ ان صفحات کو بہت سے مرد اور عورتیں پڑھ رہے ہیں۔ میں ان سب مردوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ براہ مہربانی اپنی بیویوں سے محبت کرنے کے موڈ میں یہ نہ تصور کر لینا گویا وہ مائیں اور تم ننھے بچے ہو!! کیا تم جانتے ہو کہ مرد کا ہاتھ بے ساختہ عورت کی چھاتی کی طرف کیوں بڑھتا ہے؟ وہ ہاتھ ایک چھوٹے بچے کا ہاتھ ہوتا ہے جو اپنی ماں کی چھاتی تک پہنچ رہا ہوتا ہے۔ جونہی انسان کسی عورت کی محبت سے

مغلوب ہوتا ہے اس کا ہاتھ عورت کی چھاتی کی سمت بڑھتا ہے ...... کیوں؟ ...... جنس یا محبت کے ساتھ چھاتی کا ایسا کیا تعلق ہے؟ جنس کا تو چھاتی کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا البتہ ایک بچہ ماں کی چھاتیوں سے ربط رکھتا ہے۔ وہ بچپن ہی سے اس "اس علم کا دودھ" پیتا ہے کہ اس کا رشتہ چھاتیوں سے' سرچشمہ حیات سے ہے۔ جب کوئی آدمی محبت سے چھلک رہا ہوتا ہے تو وہ ایک بیٹا بن جاتا ہے! اور انہی جذبات کا مظاہرہ کرتے ہوئے عورت کا ہاتھ کہاں پھیلتا ہے؟ یہ آدمی کے سر پہ پہنچتا ہے' انگلیاں بالوں کو سلجھانے لگتی ہیں۔ یہ بچے کی یاد ماضی ہوتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر محبت بھرپور طور پہ کھل اٹھے تو روحانی سطح پہ خاوند بیٹا بن جاتا ہے' اسے ضرور بیٹا بن جانا چاہیے! اب انسان اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ جنس کی تیسری سطح یعنی روحانی سطح پہ پہنچ چکا ہے۔ ہم اس رشتے سے لاعلم ہیں۔ خاوند اور بیوی کا رشتہ ایک انجام نہیں بلکہ آغاز ہے۔ یہ تو ایک سفر ہے۔ اور یاد رکھو! خاوند اور بیوی ہمیشہ ایک تناؤ کی حالت میں رہتے ہیں کیونکہ یہ تو ایک سفر ہے۔ سفر ہمیشہ تھکا دینے والا ہوتا ہے' سکون ہمیشہ منزل پہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ خاوند اور بیوی کبھی پرسکون نہیں ہو سکتے' کیونکہ وہ ہمیشہ متحرک' ہمیشہ راستے میں ہوتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ تو راستے ہی میں ختم ہو جاتے ہیں اور منزل پہ نہیں پہنچ پاتے۔ اسی وجہ سے خاوند اور بیوی کے بیچ ایک داخلی کشمکش موجود رہتی ہے۔ ہر وقت کے اس مناقشے کو ہم محبت کا نام دے بیٹھے ہیں۔

بد قسمتی سے اس تناؤ کی حقیقی وجہ سے نہ تو خاوند اور نہ ہی بیوی آگاہ ہوتی ہے۔ وہ سوچتے ہیں کہ جوڑا ہی غلط بنا تھا۔ خاوند سوچتا ہے کہ اگر اس کی بیوی کوئی اور عورت ہوتی تو شاید سب ٹھیک ہوتا۔ میں تمھیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ یہ تجربہ ساری دنیا کے جوڑوں کا مشترک تجربہ ہے۔ اگر تمھیں اپنی شریک حیات کو تبدیل کرنے کا موقع دیا جائے تو صورت حال ذرا سی بھی تبدیل نہیں ہو گی۔ یہ عمل جنازے کے دوران کندھے بدلنے کے مترادف ہو گا۔ تم کندھا بدل لو گے اور عارضی طور پر راحت

محسوس کرو گے تھوڑی مدت بعد تمھیں احساس ہو گا کہ وزن تو جوں کا توں ہے۔ مغرب کا' جہاں طلاقیں قابو سے باہر ہیں' تجربہ یہ ہے کہ نئی بیوی کچھ عرصے بعد پہلی بیوی جیسی ہی ثابت ہوتی ہے۔ پندرہ ہی دنوں میں نیا خاوند بھی پہلے خاوند جیسا ہی ثابت ہوتا ہے۔ وجہ ظاہری نہیں ہے بلکہ گہری ہے۔ اس کا سبب کوئی فرد ------ مرد یا عورت۔۔ نہیں ہے۔ بلکہ اس کی وجہ سفر ہے' ایک عمل ہے' جو نہ تو متھا ہے اور نہ منزل۔ منزل ہے تو بس وہاں جہاں عورت ماں ہو جاتی ہے اور مرد بیٹا!

ایک دوست نے اس حوالے سے مجھ سے کچھ پوچھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ مجھے جنس کے حوالے سے سند تسلیم نہیں کرتے۔ وہ مجھ سے خدا کے متعلق جاننے پر راضی ہیں لیکن جنس کے بارے میں نہیں۔ وہ اور ان کے کچھ اور دوست مجھ سے خدا کے بارے میں سننا چاہتے ہیں۔

شاید وہ نہیں جانتے کہ جس شخص کو ہم جنس تک کے بارے میں سند تسلیم نہ کرتے ہوں اس سے خدا کے متعلق پوچھنا بے فائدہ ہوتا ہے۔ کیا تم کسی ایسے شخص سے کے ٹو کی چوٹی کے بارے میں پوچھ سکتے ہو جس نے اولین کیمپ تک نہ دیکھا ہو؟ اگر جنس کے متعلق میرا کہا تمھارے لئے ناقابل قبول ہے تو تمھیں مجھ سے خدا کے متعلق نہیں پوچھنا چاہیے۔ اگر میں پہلے ہی قدم پر ناقابل قبول ہوں تو تمھارا استفسار رائیگاں ٹھہرے گا۔ میں اس صورت میں کیونکہ آخری قدم کے بارے میں بتانے کا اہل ہو سکتا ہوں؟ اس استفسار کے پس پردہ جو نفسیات کارفرما ہے وہ رام اور کاما یعنی خدا اور جنس کو ایک دوسرے کا دشمن سمجھتا ہے۔ اب تک اسے اہمیت نہیں دی گئی کہ وہ لوگ جو مذہب کے متلاشی ہیں' جنس کے لئے کچھ سعی نہیں کرتے اور جو لوگ جنس کے بارے میں گہری تفتیش کر رہے ہیں وہ روحانی معاملات سے کوئی مس نہیں رکھتے۔

یہ دونوں مغالطے ہیں۔ کاما کی طرف سفر راما کی طرف بھی سفر ہے۔ جو سفر شہوت کا ہے وہ ضرور نور کا بھی ہے۔ جنس کے لئے انتہائی درجہ کشش دراصل ترفع کی تلاش ہے اور اسی لئے آدمی جنس سے مکمل سیر ہو چکا ہے۔ ایسا کبھی محسوس نہیں کیا

گیا کہ اس مغالطے میں کافی کچھ ہو چکا ہے۔ جب تک راما حاصل نہیں ہو گا' تلاش جاری رہے گی اور اس کی تلاش ترفع کی نہیں ہے جو کاما کو' جنس کو مسترد کرتا ہے اور راما کو پانے کا سفر آغاز کرتا ہے۔ یہ سوائے فراریت کے کچھ بھی نہیں اور وہ بھی راما کے نام پر۔ وہ لوگ کاما سے بچنے کے لئے خود کو راما کے پردے میں چھپاتے ہیں کیونکہ وہ جنس سے سخت خوفزدہ ہیں' کیونکہ ان کی زندگیاں جنس کے باعث مضطرب ہیں۔ وہ راما کے نام کی مالا جپ کر پناہ تلاش کرتے ہیں ------ تاکہ وہ کاما کے' جنس کے بارے میں بھول جائیں۔ جہاں کہیں کوئی شخص راما کا نام جپ رہا ہو اس کا پوری طرح مشاہدہ کرو' راما کی آواز کے پس پردہ کاما گونج رہی ہو گی۔ جنس کی آگہی وہاں سدا حاضر و موجود ہوتی ہے۔ جیسے ہی کوئی عورت آتی ہے' وہ راما راما جپنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر کوئی عورت قرب وجوار میں ہو تو وہ گروالی انداز میں مالا جپنے اور بلند تر آواز میں راما راما پکارنے لگتے ہیں۔

کاما جو داخل میں ہے' باہر آنا چاہتی ہے اور فراریت پسند راما کا نام جپ کر اسے دبانے کی' نظر انداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ایسی طفلانہ کوششوں سے زندگی بدلی جا سکتی' تو دنیا بہت عرصہ پیشتر ہی بہتر ہو چکی ہوتی۔ مذہب کو پانا سہل نہیں ہے۔

اگر تم راما تک پہنچنا چاہتے ہو تو کاما کو جاننا لازمی ہے --- اگر تم ترفع کی تلاش میں ہو' ورائے ذات کی تلاش میں ہو! راما کے لئے کاما کو جاننا کیوں ضروری ہے؟ ----- ایک آدمی بمبئی سے کلکتہ جانا چاہتا ہے۔ اسے کلکتہ کے بارے میں معلومات ہونی چاہییں' اس کا محل وقوع اور سمت وغیرہ لیکن اگر اسے یہ پتا نہیں ہے کہ بمبئی کدھر ہے' کلکتہ سے یہ کس سمت میں واقع ہے تو کیا وہ کبھی اپنے مشن میں کامیاب ہو سکتا ہے؟ کلکتہ پہنچنے کے لئے یہ قطعاً" ضروری ہے کہ بمبئی کا علم ہو کہ یہ کہاں ہے یعنی یہ علم ہو کہ مسافر خود کہاں ہے۔ اگر مجھے بمبئی کے بارے میں کوئی جانکاری نہ ہو اور کلکتہ کے بارے میں ساری معلومات اور اعداد وشمار موجود ہوں تو یہ بے کار ہیں کیونکہ بہرحال مجھے سفر کا آغاز تو بمبئی ہی سے کرنا پڑے گا۔ نقطہ آغاز پہلے آتا ہے اور نقطہ اختتام بعد

میں۔ تم اب کہاں کھڑے ہو؟

تم راما کو سفر کے لئے آرزو مند ہو۔ خوب! تم خدا تک پہنچنا چاہتے ہو۔ بہت خوب! لیکن اب تم کہاں کھڑے ہو؟ اب تم شہوت میں ہو۔ تم جنس میں بے یارومددگار ہو چکے ہو۔ یہ تمھاری رہائش گاہ ہے جہاں سے سفر آغاز ہوتا ہے۔ لہٰذا جہاں ہم ہیں اس سٹیشن کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ حقیقت سے آگاہ ہو کر' مکمل حقیقت کا ادراک کرتے ہوئے ہم یہ جان سکتے ہیں کہ آئندہ کا امکان کیا ہے؟ ہم کیا حاصل کر سکتے ہیں؟ یہ جاننے کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں پتا ہو کہ ہم کیا ہیں؟ آخری قدم تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے قدم تک پہنچا جائے کیونکہ پہلے قدم ہی سے دوسرے قدم کی راہ ہموار ہوتی ہے اور آخرکار سفر کے آخری قدم کی۔ اگر پہلا قدم ہی غلط سمت میں اٹھے تو تم مطلوبہ منزل پر نہیں پہنچ سکتے۔ بلکہ تم کسی ویرانے میں بھی پہنچ سکتے ہو۔ لہٰذا یہ زیادہ اہم ہے کہ پہلے کاما کو سمجھو پھر راما کو ــــــ اگر تم مطلق کو' آفاقی کو پانا چاہتے ہو ــــــ تم وہاں تک جنس کو سمجھے بغیر نہیں پہنچ سکتے۔

نیز مجھے کسی شخص نے یہ بھی کہا ہے کہ فرائڈ کی رائے قابل قبول اور ایماندارانہ ہو سکتی ہے لیکن سوال کنندہ میری رائے کو کیونکر سچی اور مخلصانہ تسلیم کر سکتا ہے؟

یہ کیونکر طے ہو سکتا ہے کہ میں مخلص اور دیانت دار ہوں کہ نہیں؟ اگر میں اس حوالے سے کوئی بات کہتا ہوں تو وہ فیصلہ کن نہیں ہو سکتی کیونکہ میں بذات خود مقدمے کا موضوع ہوں۔ اگر میں خود کو ایماندارانہ کہتا ہوں تو یہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اس میں بھی کوئی معنویت نہیں ہوگی اگر میں خود غیرایماندار کہوں کیونکہ یہ قابل بحث امر ہے کہ آیا وہ شخص جو یہ بیان دے رہا ہے ایماندار ہے یا نہیں۔ پس میں اس بارے میں جو کچھ بھی کہوں وہ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ فضول ہے۔ تم جنس کی اقلیم میں آزمائش کر سکتے ہو اور اپنے متعلق جان سکتے ہو کہ دیانت دار ہو یا نہیں۔ جب تم تجربہ کر لو گے تو تمھیں میرے بیان کی سچائی سے آگاہی ہو جائے گی' اس کے علاوہ تو مسئلے کو طے کرنے کی کوئی راہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر میں تمھیں تیراکی کی

تکنیک کے بارے میں بتاتا ہوں تو تمھیں شک رہے گا کہ میرا بتایا ہوا طریقہ درست ہے کہ نہیں۔ میرا جواب اس بارے میں یہ ہے کہ تم دریا میں اتر سکتے ہو' ساحل سمندر پر آ سکتے ہو اور پانی میں اتر سکتے ہو۔ اگر دریا پار کرنے میں میری ترکیب کارگر ہو تو تمھیں اس نتیجے پر پہنچ جانا چاہیے کہ جو کچھ میں نے کہا تھا وہ بے فائدہ یا غیر مخلصانہ نہیں تھا۔

جہاں تک فرائڈ کا سوال ہے تو میں اپنے دوست پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ یہ ممکن ہے کہ جو کچھ میں یہاں بتا رہا ہوں فرائڈ اس سے آگاہ نہ ہو۔ فرائڈ ان چند اہل بصیرت میں سے ہے جنھوں نے انسانیت کو آزادی کی سمت میں رہنمائی فراہم کی لیکن بہرحال وہ روحانی جنس کے بارے میں کوئی آگاہی نہیں رکھتا تھا۔ فرائڈ نے جس نوع کا علمی نظام پیش کیا ہے وہ "بیمار جنس" پر استوار ہے۔ اس کی تحقیق ماہر امراض کی سی ہے۔ فرائڈ ایک طرح کا ڈاکٹر ہے اور اس کی اختراعات بیمار افراد کا علاج کرنے کے مماثل ہیں۔ اس نے نارمل صحت مند جنس کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔ وہ بیماری اور کجروی کا تحقیقی عالم ہے کیونکہ بنیادی طور پر اس کا دماغ علاج معالجے ہی کی تربیت رکھتا ہے۔

لہٰذا اگر تم میری صداقت کی تصدیق چاہتے ہو تو تمھیں تنتر فلسفے کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ تنتر جنس کو روحانی بنانے کی کوشش کرتا ہے لیکن ہم نے ہزاروں برس سے تنتر فلسفے کے بارے میں سوچنے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ کھجوراہو کی یادگاریں نیز پوری اور کونارکا کا معبد اس کے جیتے جاگتے ثبوت ہیں۔ کیا تم کبھی کھجوراہو گئے ہو؟ کیا تم نے وہاں مجسمے دیکھے ہیں؟ اگر دیکھے ہیں تو تمھیں ضرور حیرت ناک مظاہر کا تجربہ ہوا ہو گا ــــــ اول تم نے عریاں مجسمے دیکھنے کے بعد بھی ان میں عریانیت محسوس نہیں کی ہو گی۔ تم نے عملی مباشرت میں مصروف عریاں جوڑوں کے مجسموں کو بھی کراہت انگیز اور برا محسوس نہیں کیا ہو گا۔ اس کے برعکس تمھیں سکون کا تجربہ ہوا ہو گا' ایک تقدس تم پر محیط ہو گیا ہو گا۔ یہ ردعمل تو سراسر حیران کن ہے۔ وہ اہل بصیرت جنھوں نے ان مجسموں کو تخلیق کیا تھا' وہ لوگ تھے جو روحانی جنس کو اچھی

طرح جانتے تھے اور اس سے مکمل آشنا تھے۔

اگر تم کو کسی شخص کو جنس کے انتہائی برے موڈ میں دیکھنے کا اتفاق ہو' تو تم کو اس کی آنکھوں اور چہرے کا مشاہدہ کرنے پر کراہت انگیز' خوفناک اور درندوں جیسا دکھائی دیتا ہے۔ تم اسے پریشان اور ساتھ ہی سفاک محسوس کرو گے' اس کی آنکھوں میں شہوت ہو گی۔ جب کوئی عورت کسی شہوت سے بھرے ہوئے شخص کو خواہ وہ اسے کتنا ہی عزیز کیوں نہ ہو' اپنے قریب پاتی ہے تو وہ اسے دوست نہیں دشمن کی طرح دیکھتی ہے۔ وہ شخص اسے انسان نہیں بلکہ دوزخ کا پیغامبر دکھائی دے گا۔ لیکن ان مجسموں کے چہروں پر تمھیں بدھا کا پرشکوہ عکس اور مہاویر کی جھلک دکھائی دے گی۔ ان مباشرت اور دخول کرنے والے مجسموں کے چہروں پر جو توازن ہے وہ سمادھی کا ثمر ہے۔ ایک سکون آمیز تقدس ان سے نچڑتا ہے۔ اگر تم ان مجسموں میں دھیان کرو تو ایک ابدی سکون کی لہر تم پر محیط ہو جائے گی۔ تم لائق احترام ہو جاؤ گے۔

اگر تمھیں احتمال ہے کہ عریاں مجسمے دیکھنے سے تم پر جنسیت غالب پا لے گی تو میں التجا کرتا ہوں کہ ذرا سی دیر کئے بغیر تم سیدھے کھجوراہو جاؤ۔ کرہ ارض پر کھجوراہو ایک منفرد یادگار ہے۔ لیکن ہمارے "معلمین اخلاق مثلاً" مرحوم شری پرشوتم داس ٹنڈن اور ان کے ساتھی یہ رائے رکھتے تھے کہ کھجوراہو کی دیواروں کو کچی مٹی سے لیپ دینا چاہیے کیوں کہ یہ مجسمے جنسیت پھیلاتے ہیں جب میں نے یہ رائے سنی تو حیران رہ گیا کھجوراہو کے تعمیر کنندگان کا ایک مقصد تھا' وہ یہ کہ اگر لوگ مجسموں کے سامنے بیٹھیں اور ان کا مشاہدہ کریں تو وہ شہوت سے دستبردار ہو جائیں گے! ہزاروں برس تک وہ مجسمے مراقبے کا محور رہے ہیں۔ یہ ایک تحیرخیز عقیدہ ہے کہ جنسیت زدہ لوگوں کو کھجوراہو کے معبد جانے' اس میں مراقبہ کرنے اور ان مجسموں میں جذب ہو جانے کی ہدایت کی جاتی تھی۔ گو کہ ہم نے انسانی تجربے کی ابتدا پر ہی اس حقیقت کا ادراک کر لیا ہے۔ لیکن ہم اس کو توجہ دینے کے اہل نہیں ہو سکتے ہیں۔

اس کی مثال یہ ہے کہ اگر تم راہ چلتے ہوئے دو آدمیوں کو لڑتا ہوا پاؤ تو تم وہاں

رکنا اور لڑائی دیکھنا پسند کرتے ہو------ کیوں؟----- کیا تم نے کبھی سوچا کہ دوسروں کو لڑتا دیکھ کر تم کیا حاصل کرتے ہو؟ اسے چھوڑو' تم بہت سارے کام باکسنگ دیکھنے کے لئے ترک کر دیتے ہو---- کیوں؟----- شاید تم نہیں جانتے کہ ان میں ایک شفا بخش اثر ہوتا ہے۔ دو آدمیوں کی لڑائی دیکھنے سے تمھارے اندر کی لڑنے کی پوشیدہ جبلت کی تسکین ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص سکون سے بیٹھتا ہے اور مراقبہ کرتا ہے' ٹھنڈے ذہن کے ساتھ مباشرت کے مجسموں کو دیکھتا ہے تو اس کے اندر کا اولین جنوں ---- پاگل جنس ----- ختم ہو سکتی ہے۔ ایک آدمی کوئی مسئلہ لے کر ماہر نفسیات کے پاس گیا۔ وہ اپنے مالک کے حوالے سے بہت غصے میں تھا۔ اگر مالک اسے کچھ کہتا تو وہ غصے میں آ جاتا اور سوچتا کہ جوتا لے اور مالک کو مارنا شروع کر دے۔ لیکن تم خوب جانتے ہو کہ کوئی ملازم اپنے مالک کو یوں کب مار سکتا ہے؟ اگر تم خود ملازمت کرتے ہو یا اگر تم خود مالک ہو تو دونوں صورتوں میں اس امر حقیقی سے بخوبی آگاہ ہو گے کہ ایسا ملازم جو مالک سے اتنی نفرت کرتا ہو کہ ملازمت اور روزی کی پروا کئے بغیر مالک کو مارنے کا سوچنے لگے' بہت کم ہوتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر ملازم ملازمت' ماتحتی اور پابندی کے سبب سے ہمیشہ پریشان ہوتا ہے۔ وہ ہر وقت تخریب پر اندر سے آمادہ وتیار ہوتا ہے۔ بہرکیف اگر اس میں جرات ہوتی تو وہ ملازمت ہی کیوں کرتا؟ سو بیشتر ملازم اور ماتحت اندر کی تخریب پسندی اور غصے کو چھپائے' چہرے پر فرماں برداری کی مصنوعی مسکراہٹ سجائے کام کرتے رہتے ہیں۔

خیر' وہ آدمی جو مالک کو پیٹنے کا خواہش مند تھا اس خواہش کو دبانے لگا۔ کمپلیکس گہرا ہونے لگا اور اسے ڈر رہنے لگا کہ وہ کسی روز مالک کو پیٹ ہی نہ ڈالے۔ اب وہ اتنا بھی احمق نہیں تھا کہ اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارتے ہوئے جوتا اتارے اور اپنے روزی رساں کو پیٹ کر اپنے اندر کے اس کمپلیکس کا مظاہرہ کرے۔ پس اس نے جوتے گھر ہی میں چھوڑنے شروع کر دیئے اور ننگے پاؤں دفتر جانے لگا۔ اس تدبیر کے باوجود اس کا ذہن جوتوں ہی میں اٹکا رہا۔ جب بھی مالک اس کو کچھ کام کہتا اس کا سارا

وجود اس خواہش کے اثر سے زیروزبر ہونے لگتا ہے کہ اسے جوتوں سے پیٹ دیا جائے۔ ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ اس کے ذہن میں ساتھیوں کے جوتوں کا بھی خیال آنے لگا کہ اپنے نہیں تو کسی ساتھی کے جوتے اتار کر مالک کو پیٹنے کی اندرونی خواہش کی تسکین کرے۔ اس مرحلے پر تو وہ سخت خوفزدہ ہو گیا۔ عقل و شعور اسے احساس دلاتے تھے کہ وہ کسی روز نوکری سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ ہوتے ہوتے اس کی یہ حالت ہوئی کہ جس قدر اس نے جوتوں کے خیال کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی وہ اس کے ذہن پر حاوی ہوتے چلے گئے۔ وہ کاغذ پر پنسل سے اگر یونہی کچھ لکیریں کھینچتا تو خود بخود جوتے کا خاکہ بن جاتا۔ اب تو وہ اور بھی خوفزدہ ہوا۔ ہوتے ہوتے اس نے دفتر سے چھٹیاں کرنا شروع کر دیا۔ اس کی کارکردگی کا ریکارڈ خراب ہونے لگا۔ جب نوبت ملازمت کے جانے تک پہنچی تو وہ ماہر نفسیات کے ہاں آیا۔ ماہر نفسیات نے اسے تسلی دی کہ بیماری زیادہ سنجیدہ نہیں ہے۔ یہ قابل علاج ہے۔ اس نے ہدایت کی کہ مالک کی تصویر گھر میں لٹکا دی جائے اور وہ صبح سویرے اس تصویر کو پانچ بار جوتے مارے۔ اس امر کو روزانہ کھانے کی طرح لازمی اور عبادت کی طرح فرض سمجھ کر کیا جائے۔ دفتر سے واپسی کے بعد بھی یہ عمل روزانہ دہرایا جانا چاہیے۔ اس ہدایت کو سن کر آدمی کا پہلا ردعمل یہ تھا: "کیا حماقت ہے!" گو کہ وہ ایسا کہہ رہا تھا تاہم اندر سے خوش تھا۔ گھر لوٹ کر اس نے اپنے کمرے کی ایک دیوار پر باس کی ایک تصویر لٹکا دی اور ماہر نفسیات کی ہدایت کے مطابق روزانہ اس کو پانچ بار جوتے مارنے شروع کر دیے۔ اس پٹائی سے اس کے اندر عجیب احساس ابھرا۔ وقت گزرنے لگا اور اب اسے مالک کو دیکھ کر پہلے کی طرح غصہ نہیں آتا تھا۔ پندرہ بیس دنوں میں اس کا رویہ مالک کے لئے شائستہ ہو گیا۔ خود مالک نے بھی اس انجانی تبدیلی کو محسوس کیا۔ بہرکیف اس کو علم نہیں تھا کہ اصل صورت حال کیا ہے؟ البتہ اس نے ملازم کو یہ ضرور کہا کہ بھئی تم پہلے سے زیادہ مہذب اور شائستہ ہو گئے ہو۔ مالک نے تعریف کی کہ اب وہ زیادہ فرماں بردار اور بہتر ہو گیا ہے۔ اس نے خواہش ظاہر کی کہ ملازم اس تبدیلی کا سبب اسے بتائے۔ ملازم نے

جواباً" کہا کہ مالک اس بارے میں کچھ مت پوچھئے ورنہ سب کچھ درہم برہم ہو جائے گا۔

اس کے پیچھے کیا حکمت ہے؟ کیا تصویر کو پیٹنے سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے؟

ہاں، تصویر کو پیٹنے سے جوتے سے مالک کو پیٹنے کا خبط رفع ہو گیا۔ کمپلیکس ختم ہو گیا۔ کھجوراہو، کونارکا اور پوری جیسے معبد اس ملک کے ہر گوشے میں ہونے چاہئیں۔ دیگر معبدوں میں کچھ بھی تو اہم نہیں ہے، وہ نہ تو سائنٹفک ہیں، نہ ان میں منصوبہ بندی ہے، نہ کوئی معنویت۔ وہ معبد کوئی ضروری نہیں ہیں۔ لیکن کھجوراہو اور اس جیسے دوسرے معبدوں کا ہونا ایک معنویت رکھتا ہے۔ جس کسی کا بھی ذہن شدید جنس کی وجہ سے حد سے زیادہ تناؤ کا شکار ہو وہ ان معبدوں میں جائے اور مراقبہ کرے جب وہ لوٹے گا تو بہت ہلکا پھلکا اور نہایت پرسکون ہو گا۔ تنتر جنس کو روحانی بنانے کی تیکنیکی کوشش کرتے ہیں لیکن ہمارے ملک کے معلمین اخلاق اس پیغام کو عوام تک پہنچنے نہیں دیتے۔ یہی لوگ میری تقریروں پر بھی پابندی لگانا چاہتے ہیں۔

بھارتیہ ودیا بھون آڈیٹوریم میں میری تقریر کے بعد جبل پور واپسی کے تیسرے ہی دن مجھے ایک دوست کا خط ملا۔ اس میں مجھے بتایا گیا تھا کہ اگر میں نے تقریروں کا یہ سلسلہ جاری رکھا تو مجھے قتل کر دیا جائے گا۔ میں نے اسے جواب دینے کا سوچا لیکن شاید وہ شخص بزدل ہے۔ نہ تو اس نے خط پر دستخط کیے تھے نہ ہی اپنا پتا لکھا تھا۔ شاید وہ خوفزدہ ہو کہ میں پولیس میں رپورٹ درج نہ کرا دوں۔ تاہم اگر وہ یہ کتاب پڑھے تو میرا جواب پا سکتا ہے۔ اور اگر وہ یہاں موجود ہے تو میں اسے بتانا چاہتا ہوں کہ میں رپورٹ درج نہیں کراؤں گا۔ اسے اپنے نام اور اپنے پتے سے مجھے آگاہ کرنا چاہیے تاکہ میں اپنا جواب تو اسے بھجوا سکوں۔ اگر وہ اتنی بھی جرأت نہیں رکھتا تو میں اپنا جواب یہاں پیش کرتا ہوں، جسے وہ توجہ کے ساتھ نوٹ کرے۔ پہلا نکتہ جس سے شاید وہ آگاہ نہیں، یہ ہے کہ اسے مجھ کو قتل کرنے میں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ قاتل ہوتے ہی جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ لافانی سچ بن جائے گا۔ اگر عیسیٰ کو مصلوب نہ کیا

جاتا تو دنیا اسے کبھی کا فراموش کر چکی ہوتی۔ سزا وہی ایک طرح سے فائدہ بخش ہوتی ہے۔ میں تو یہ بھی بتا رہا ہوں جیسا کہ چارج گونزٹ نے کہا ہے کہ عیسیٰ نے خود مصلوب کروانے کا منصوبہ خود بنایا تھا! عیسیٰ کی اپنی خواہش تھی کہ اسے مصلوب کر دیا جائے تاکہ مصلوب ہونے سے اس کی تعلیمات آئندہ کے لئے زندہ جاوید سچ میں ڈھل جائیں اور لاکھوں لوگوں کو فائدہ بخشیں۔ ایسا ممکن ہو بھی سکتا ہے کیونکہ یہودا جس نے عیسیٰ کو محض تیس سکوں کے عوض بیچ دیا تھا وہ اس کے عزیز ترین پیروکاروں میں سے ایک تھا۔ یہ امر قابل یقین نہیں ہے کہ ایک شخص جو عیسیٰ کے ہمراہ برسوں رہا ہو وہ اتنے حقیر معاوضہ لے کر عیسیٰ کو فروخت کر دے۔ ایسا اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک خود عیسیٰ نے اسے ایسا کرنے کا' وفاداری بدلنے کا اشارہ نہ کیا ہو اور ممکن ہے سزا دہی کا بھی اشارہ کیا تاکہ عیسیٰ کے الفاظ تقطار کا ابدی فوارہ بن جائیں اور اربوں لوگوں کو نجات عطا کریں! دنیا میں تین کروڑ جینی ہیں۔ اور اگر مہاویر کو پھانسی ہو جاتی تو وہ صرف تین کروڑ نہ ہوتے۔ لیکن مہاویر سکون سے انتقال فرما گئے۔ شاید انھیں پھانسی لگ کر مرنے کا خیال بھی نہ آیا ہو۔ نہ تو انھیں کسی نے پھانسی دینے کی کوشش کی اور نہ ہی انھوں نے خود اس کا بندوبست کیا۔ نہ تو بدھا' نہ ہی محمدؐ' نہ تو رام' نہ ہی کرشن اور نہ ہی مہاویر بلکہ صرف عیسیٰ کو صلیب پر میخوں سے ٹھونکا گیا! اور آج آدھی دنیا عیسائی ہے۔ ممکن ہے ساری دنیا عیسائی ہو جائے ---- یہ ہے پھانسی چڑھ جانے کا روشن پہلو۔ لہٰذا میں اپنے دوست سے کہتا ہوں مجھے مارنے میں جلدی مت کرو ورنہ ساری عمر پچھتاؤ گے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اسے صورت حال سے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ میں خود بھی چارپائی پر پڑے پڑے مرنا نہیں چاہتا۔ میں خود کو گولی مارنے والے کو اپنی حد تک ملنے کی کوشش کروں گا۔ وہ ایسا کرنے میں جلدی نہ کرے کیونکہ میں اس کے لئے موزوں وقت آنے پر خود کوشش کروں گا۔ زندگی فائدہ بخش ہے لیکن قتل ہوا جائے تو موت بھی سودمند ہو جاتی ہے۔ گولی سے آنے والی موت اس کام کو مکمل کر دیتی ہے جو

زندگی میں ادھورا رہتا ہے۔ دشمن ہمیشہ یہ مہلک غلطی دہرایا کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے سقراط کو زہر دیا' وہ لوگ جنھوں نے منصور کو قتل کیا' وہ لوگ جنھوں نے عیسیٰ کو مصلوب کیا ان سب نے احمقانہ عمل کیا' وہ ان کی سعی لاحاصل تھی۔

اور حال ہی میں جس شخص نے گاندھی کو گولی ماری تھی' نہیں جانتا تھا کہ گاندھی کا کوئی سچا پیروکار بھی ان کو ناقابل فراموش نہیں کر سکتا تھا مگر اس نے کر دیا۔ جب گاندھی گولی لگنے سے مر رہے تھے تو انھوں نے ہاتھ جوڑ کر رکوع کیا تھا' ان کا یہ ہاتھ جوڑنا اور رکوع کرنا نہایت معنی خیز تھا! یہ اشارہ تھا اس حقیقت کی طرف کہ آخرکار گاندھی کا بہترین اور آخری چیلا آ ہی گیا جس نے انھیں لافانی بنا دیا۔ بھگوان نے من چاہا شخص بھیج دیا! قتل کئے جانے سے کوئی نہیں مرا کرتا۔ قتل کرنا فقط لافانی ہونے میں تعاون ہوتا ہے۔

زندگی کی داستان بہت پیچیدہ ہے۔ فسانہ زندگی تحیر سے معمور ہے۔ معاملات اتنے سادہ نہیں ہیں یہاں! جو شخص چارپائی پر مرجاتا ہے ہمیشہ کے لئے مرجاتا ہے اور جو گولی سے مرتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جاتا ہے۔ جب سقراط کے لئے زہر تیار کیا جا رہا تھا تو اس کے دوستوں نے پوچھا کہ اس کے جسم کے ساتھ کیا کیا جائے؟ کیا اسے جلایا جائے یا دفن کیا جائے؟ سقراط یہ سن کر ہنس پڑا اور بولا: "بے وقوفو! تم نہیں جانتے کہ تم مجھے دفنانے کے اہل ہی نہیں ہو۔ میں اس وقت بھی زندہ ہوں گا جب تم نہیں ہو گے! مرنے کی جو ترکیب میں نے وضع کی ہے وہ ہمیشہ جینے کے لئے ہے!"

پس میرے دوست! اگر تم یہاں ہو تو تمھیں نوٹ کرنا چاہیے کہ بے سوچے سمجھے قدم مت اٹھا بیٹھنا ورنہ جلد بازی کی وجہ سے تم اپنا ہی نقصان کر بیٹھو گے۔ مجھے نقصان نہیں ہو گا کیونکہ میں ان میں سے نہیں ہوں جن پر گولیاں اثرانداز ہو سکتی ہیں۔ میں ان میں سے ہوں جو گولی کے زخموں سے زندہ ہو جاتے ہیں۔ اسے عجلت نہیں برتنی چاہیے۔ اسے ہیجانی بھی نہیں ہونا چاہیے کیونکہ میں خود بستر پر نہ مرنے کے لئے کوشاں ہوں۔ بستر پر موت لاحاصل ہوتی ہے' یہ ایک لایعنی موت ہوتی ہے۔

اور تیسرا نکتہ اس کے ذہن نشین کرنے کا یہ ہے کہ خطوں پر دستخط کرنے اور پتا لکھنے سے خوف زدہ مت ہو کیونکہ اگر میں مان گیا کہ کوئی اتنا دلیر شخص بھی ہے جو مجھے مارنے پر آمادہ ہے تو میں کسی کو بتائے بغیر مقررہ مقام پر پہنچ جاؤں گا تاکہ وہ قتل میں ملوث نہ ہو۔

لیکن اس شخص کے لئے کوئی شے عجیب نہیں۔ ایسے پاگل ہوا کرتے ہیں۔ خط لکھنے والے نے اس یقین کے ساتھ لکھا ہے کہ وہ مذہب کو بچا رہا ہے۔ اس نے یہ سوچ کر لکھا ہے کہ میں مذہب کو برباد کر رہا ہوں اور وہ مذہب کو بچا رہا ہے۔ اس کا رجحان بدباطنی کا نہیں ہے۔ اس کے احساسات نہایت مخلصانہ اور نہایت مذہبی ہیں۔ کچھ مذہبی لوگ دنیا کے جذبات سے کھیلتے رہے ہیں۔ ان کے رجحانات بہت اچھے لیکن ذہانتیں بہت بری ہیں۔ ایسے زہر فروش لوگوں اور ان کے پیروکاروں نے زمانوں سے زندگی کی سچائیوں کی مکمل نشوونما روک رکھی ہے۔ علم کا گلا گھونٹ دینے سے لاعلمی ہر سو پھیل گئی ہے۔ اور ہم لاعلمی کی رات میں کھوئے ہوئے ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرتے ہیں۔ ان مبلغین اخلاق نے ہماری لاعلمی کی تاریکی کے عین درمیان میں ہمیں وعظ دینے کے لئے اونچے منبر کھڑے کر لئے ہیں۔ یہ بھی مساوی حقیقت ہے کہ جب ہماری زندگیوں میں سچ کی کرنیں اجالا بکھیرنے لگیں گی تو یہ لوگ غیر اہم ہو جائیں گے۔ جب ہم سادھی میں خدا کے ساتھ جیتا جاگتا رشتہ استوار کرنے کے قابل ہوتے ہیں' ہماری دنیوی معمولی زندگیاں الوہی زندگیوں میں ڈھلنا شروع ہوتی ہیں تب مبلغوں کے لئے کوئی جگہ نہیں رہتی۔ مبلغ اس وقت تک فائدے میں رہتا ہے جب تک لوگ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے ہیں۔ لوگ بیمار ہوتے ہیں تو ڈاکٹر کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اگر لوگ ہی بیمار نہ پڑیں تو ڈاکٹر ختم ہو جائیں گے۔ میڈیکل کا پیشہ' مبلغوں کے پیشے کی طرح داخلی تضاد سے معمور ہے کیونکہ بیمار لوگ ڈاکٹر کی زندگی ہیں۔ اگرچہ ایک ڈاکٹر بظاہر مریضوں کا علاج کرتا دکھائی دیتا ہے تاہم وہ لوگوں کے بیمار پڑنے کا منتظر اور خواہش مند رہتا ہے۔ اور جب کوئی وبا پھیلتی ہے تو وہ خدا کا شکر ادا

کرتا ہے کہ "کاروبار" تو چلا "موسم" تو آیا۔

میں نے کافی پہلے ایک کہانی سنی تھی۔ کہانی یوں ہے کہ ایک شب کچھ دوست ایک پارٹی ترتیب دیتے ہیں۔ وہ سب ایک مے خانے میں اکٹھے ہو کر شراب پیتے اور اچھے کھانے کھاتے ہیں۔ پارٹی کا سلسلہ رات کے پچھلے پہر تک طول کھینچ جاتا ہے۔ جی بھر کر پینے' کھانے' لطیفے سنانے' ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے رقص کرنے میں وہ سب دوست محو رہتے ہیں۔ جب صبح سے ذرا ہی پہلے وہ رخصت ہونے لگتے ہیں تو مے خانے کا مالک اپنی بیوی سے کہتا ہے کہ خدا کا شکر ادا کرو جس نے اتنے زیادہ گاہک بھیجے۔ اگر اسی طرح رش رہا تو ہم جلد امیر ہو جائیں گے۔ پارٹی کا میزبان سب مہمانوں کو الوداع کرنے کے بعد جب مے خانے کے مالک کو بل کی رقم ادا کرنے لگا تو اس نے خوش اخلاقی اور کاروباری آداب کے تحت دعا کی کہ خدا اس کے کاروبار میں ترقی دے تاکہ وہ دوبارہ اپنے دوستوں کے ساتھ اتنی شاندار محفل سجا سکے۔ مے خانے کے مالک نے برسبیل تذکرہ یہ بھی پوچھا "یہ تو بتایئے کہ آپ کاروبار کیا کرتے ہیں جناب؟" "میں تدفین کار ہوں۔ جب لوگ مرتے ہیں تو میرا کاروبار ترقی پاتا ہے۔"

اسی طرح ڈاکٹر کا پیشہ لوگوں کو شفا بخشنے کا ہے لیکن جب زیادہ لوگ بیمار ہوں گے تب ہی ڈاکٹر امیر ہو گا' اس کی دلی خواہش تو یہی ہوتی ہے کہ مریض جلد صحت یاب نہ ہو۔ اس لئے ہی تو امیر مریضوں کو صحت یاب ہوتے ہوتے وقت لگتا ہے۔ غریب مریض جلد صحت یاب ہو جاتے ہیں کیونکہ غریب کی طویل بیماری سے ڈاکٹر کو زیادہ یافت نہیں ہوتی۔

مبلغ بھی اسی طبقے کا حصہ ہیں۔ لوگ جس قدر اخلاق سے مبرا ہوں گے' جتنا زیادہ غیر مہذب عوامل بڑھیں گے ...... اتنا ہی انارکی پھیلے گی' اتنا ہی زیادہ مبلغوں کے منبر اونچے ہوں گے۔ کیونکہ تب ہی تو مبلغوں کی طلب زیادہ ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کو عدم تشدد اختیار کرنے' سچ کا راستہ اپنانے' دیانت داری برتنے' قانون کی پابندی کرنے اور

عقائد سے وابستگی وغیرہ کی تبلیغ کریں۔ اگر لوگ راست رو، منظم، پرامن، دیانت دار، مقدس اور قابو میں ہوں تو مبلغ فنا ہو جائے گا۔

ہندوستان میں اس قدر مبلغوں اور پیشواؤں کی موجودگی کا ایک جواز کیا ہے؟ ساری دنیا سے بھی زیادہ مذہبی پیشوا اور مبلغ! ہر جگہ، ہر گھر میں ایک واعظ، پنڈت، گرو، سوامی یا راہب کیوں ہے؟ مذہبی پیشواؤں کے اتنے میزبان یہاں کیوں ہیں؟ یہاں پنڈتوں کی کثرت سے کسی کو یہ نہیں فرض کر لینا چاہیے کہ ہم بہت مذہبی لوگ ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ آج ہم دنیا کا سب سے زیادہ لادین اور اخلاق سے عاری ملک بن چکے ہیں۔ لہٰذا ہمارے ملک میں بہت زیادہ مبلغوں کو کاروبار کے مواقع میسر ہیں۔ یہ ہماری قومی شناخت بن چکی ہے۔ میرے ایک دوست نے مجھے ایک امریکی میگزین میں شائع شدہ مضمون بھجوایا ہے۔ وہ اس میں ایک اشکال پر میری رائے جاننا چاہتے ہیں۔ یہ ایک بڑا مزاحیہ مضمون ثابت ہوا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ کسی بھی ملک کے لوگوں کا کردار انھیں شراب پلا کر دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر ایک جرمن کو ڈٹ کر شراب پلا دی جائے تو وہ کھانے پر ٹوٹ پڑتا ہے اور ڈائننگ ٹیبل سے ہٹنے پر آمادہ ہی نہیں ہوتا، وہ دو سے تین گھنٹوں تک کھاتا ہی چلا جائے گا۔ اگر ایک فرانسیسی کو شراب پلا دی جائے تو وہ گانے اور ناچنے کے لئے بے قرار ہو جائے گا۔ اگر کوئی انگریز زیادہ شراب پی جائے تو وہ ایک کونے میں خاموش بیٹھ جائے گا۔ انگریز عموماً خاموش طبع ہوتے ہیں لیکن شراب پی کر تو وہ اور زیادہ متین ہو جائے گا۔ مختلف قوموں کے لوگوں کے مخصوص رد عمل اسی اسلوب میں بیان کئے گئے تھے۔ لیکن شاید غلطی یا لاعلمی کی وجہ سے ہندوستان کے لوگوں کا ذکر رہ گیا۔ میرے دوست نے پوچھا کہ میں اسی تسلسل میں ہندوستانیوں کے متعلق کیا کہنا چاہوں گا؟ اگر کوئی ہندوستانی زیادہ شراب پی لے تو وہ کیا کرے گا؟ میں نے اسے بتایا کہ اس سوال کا جواب تو اظہر من الشمس ہے۔ اگر کوئی ہندوستانی بہک جائے تو فوراً" تبلیغ کرنا شروع کر دے گا۔ یہ ہے ہمارا قومی کردار! مبلغوں، زاہدوں، درویشوں اور گروؤں کی یہ لامختتم صف اشارہ ہے اس بات کا کہ

بیماری، ایک وبا پھیلی ہوئی ہے، یہ ایک علامت ہے اخلاقیات کی عدم موجودگی کی۔ اور انوکھی بات تو یہ ہے کہ ان راہنماؤں میں سے کوئی ایک بھی اپنے دل کی گہرائیوں سے اس عدم اخلاقیات کے خاتمے کی خواہش نہیں کرتا کیونکہ جونہی بیماری رفع ہوئی، مبلغ فنا ہو جائیں گے۔ ان کی داخلی آرزو یہی ہے کہ بیماری بڑھتی رہنی چاہیے اس بیماری کو برقرار رکھنے کا آسان ترین راستہ یہی ہے کہ زندگی کے علم کی نشوونما کو روک دیا جائے اور انسان کو زندگی کے گہرے اور اہم گوشوں کے ادراک سے ڈرا دیا جائے۔ ان سے لاعلمی خودبخود عدم اخلاق، عیاشی اور کرپشن کو پھیلانے کا باعث بن جائے گی۔ اگر لوگ زندگی کے ان گہرے درخشاں گوشوں کو جاننے کی کوشش کریں تو لاوینیت اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی بیماریاں ایک ایک کر کے ختم ہونا شروع ہو جائیں گی۔ میں تمھاری توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ عدم اخلاق کا انتہائی بنیادی اور ذمہ دار سرچشمہ جنس ہے۔ یہ انسان میں ہمیشہ کجروی، عیاشی اور بے کیفی کا ایک جبلی اور انتہائی موثر مرکز رہی ہے۔ چنانچہ مذہبی پیشوا اس کے متعلق بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔

میرے ایک دوست نے پیغام بھیجا ہے: "کوئی ولی، کوئی گرو جنس کے بارے میں بات نہیں کرتا۔ جنس کے بارے میں آپ کی تقریریں سن کر میرے دل میں آپ کی جو ازحد عزت تھی وہ ختم ہو گئی ہے۔"

میں نے اسے بتایا کہ غلطی اور کہیں نہیں ہے، بنیادی طور پر، اگر احترام تھا، تو غلطی اس میں نہاں تھی۔ میرا احترام کیوں ضروری ہے؟ اس کے پیچھے کیا مقصد کارفرما ہے؟ میں نے کب تم سے اپنی عزت کرنے کا کہا ہے؟ اگر تم میری عزت کرتے تھے تو یہ تمھاری غلطی تھی۔ اگر اب تم اس پر مائل نہیں ہو تو یہ تمھارا حق ہے۔ نہ تو میں کوئی مہاتما ہوں، نہ بننا چاہتا ہوں۔ اگر میں مہاتما یا گرو بننے کی معمولی سی بھی خواہش رکھتا تو یقیناً" یہ موضوع کبھی منتخب نہ کرتا۔ ایک مہاتما اس وقت تک مہاتما نہیں بن سکتا جب تک وہ اپنا موضوع منتخب کرنے میں ہوشیاری نہ دکھائے۔ لیکن میں کبھی مہاتما

نہیں تھا۔ میں مہاتما نہیں ہوں۔ اور یہ یقینی امر ہے کہ میں مہاتما بننے کی خواہش نہیں رکھتا کیونکہ یہ خواہش فی نفسہ گہری' نفیس انا پرستی کو پروان چڑھاتا ہے۔ میں ایک انسان ہوں اور یہی میرے لئے کافی ہے۔ آیا کیا صرف انسان ہونا کافی نہیں؟ کیا انسان انسانوں کے کندھوں پر چڑھے بغیر' اپنی انا مسلط کئے بغیر' طاقت حاصل کئے بغیر----- ایک یا دوسری صورت میں ---- خوش نہیں رہ سکتا؟ صرف ایک انسان رہتے ہوئے؟ ----- میں جس حالت میں ہوں خوش اور مطمئن ہوں۔ میں انسانیت میں عظمت کا خواہش مند ہوں۔ میں ایک عظیم انسان کا آرزو مند ہوں۔ آیا کیا یہ عظمت نہیں کہ بشریت کی کامل اقدار کے ساتھ انسان بنا جائے؟ اور ہر آدمی عظیم بن سکتا ہے کیونکہ صحیح معنوں میں ہر انسان عظیم بننے کا اہل ہے۔ گروؤں اور مہاتماؤں کے زمانے گئے۔ مہاتماؤں کی مزید کوئی ضرورت نہیں رہی۔ عظیم انسان ضروری ہے۔ عظیم انسانیت وقت کی ضرورت ہے۔ دنیا میں بہت سے عظیم لوگ ہو گزرے ہیں۔ ہم نے ان سے کیا حاصل کیا ہے؟ یہی کہ عظیم انسان نہیں بلکہ عظیم انسانیت ناگزیر ہے۔

مجھے خوشی ہوگی اگر صرف ایک آدمی بھی مغالطے سے نکل آئے۔ کم ازکم ایک آدمی کو تو معلوم ہو کہ میں عظیم انسان نہیں ہوں۔ یہ بھی ایک اہم تسلی بخش امر ہے کہ ایک آدمی تو مغالطے میں نہیں ہے! دوست نے مجھے اس خیال کے ساتھ پیغام بھیجا ہے کہ مجھے مہاتمائیت کی طرف راغب کیا جائے۔ وہ سوچتا ہے کہ اگر میں ایسے موضوعات پر بحث کرنا ترک کروں تو ایک عظیم گرو بن جاؤں گا۔ اب تک تو مہاتما اور گرو ایسی ہی تکنیکوں سے احمق بنائے گئے ہیں اور نتیجے کے طور پر ان عظیم مگر کمزور لوگوں نے ایسے موضوعات پر بات نہیں کی جو ان کی مہاتمائیت اور گروپنے کے منصب کے لئے تباہ کن ثابت ہو سکتے تھے۔ اپنے "تخت" کی حفاظت کے طمع میں انہوں نے کبھی اس امر کی پروا نہیں کی کہ زندگی پر وہ کس قدر نقصان دہ اثرات مرتب کر رہے ہیں۔ میں اس نوع کے مناصب بلند کے لئے متفکر نہیں ہوں۔ میں نے ان کا خواب نہیں دیکھا۔ اس کے لئے میں نے کوئی منصوبے نہیں بنائے ہیں۔ اس کے برعکس میں

تو اس وقت سے ہراساں رہا ہوں جب کوئی شخص مجھے مہاتما بنانا چاہے۔ آج مہاتماؤں اور گروؤں کی افراط ہے۔

مسئلہ یہ نہیں ہے کہ مہاتما کیسے میسر ہو سکتا ہے بلکہ اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ حقیقی انسان کیسے پیدا کیا جا سکتا ہے؟ اس مقصد کے حصول کے لئے ہم کیا کر سکتے ہیں؟ ہمیں کیا جدوجہد کرنی چاہیے؟ مجھے امید ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میں جتنے بنیادی عوامل اپنے موضوع کے حوالے سے زیر بحث لایا ہوں وہ درست طور پر جنس کی رکاوٹیں توڑنے میں تمھاری معاونت کریں گے۔ اس روشنی میں ایک راستہ دکھایا جا سکتا ہے ------ روح کی سمت میں۔ یہ ممکن ہے کہ تم بتدریج اپنی شہوت ------ اپنی جنس کی قلب ماہیت پر قادر ہو جاؤ! اب جیسا کہ فی الوقت ہم ہیں' ہم شہوت ہیں' روح نہیں ہیں۔ آنے والی کل میں ہم روح میں ڈھل سکتے ہیں لیکن فقط اس صورت میں کہ مکمل جنس کی بتدریج قلب ماہیت کی جائے۔ اور تب دوام شروع ہو گا!

جو کچھ میں قبل ازیں بتا چکا ہوں اس کے بارے میں بہت سے دوستوں نے ایک سے سوال دریافت کئے ہیں۔ میں اس سلسلے میں کچھ بنیادی نکات بیان کروں گا۔

میں نے تمہیں بتایا ہے کہ اختلاط کے دوران میں سمادھی کی مسلسل جھلکیوں کی آگاہی ہونی چاہیے۔ آدمی کو سمادھی کے اس نکتے' اس پہلو کو سمجھنا چاہیے جو اختلاط کے وسط میں بجلی کی طرح چمکتا ہے۔ جو ایک سیکنڈ کے لئے کسی ہاتھ نہ آنے والی شے کی طرح سمٹتا ہے اور غائب ہو جاتا ہے۔ اگر تم صرف ایک دفعہ بھی مکمل طور پر خلط کر سکتے ہو تو تمہیں ادراک ہو گا کہ اس لمحے میں تم کسی اور شے میں ڈھل جاتے ہو۔ جسم پیچھے رہ جاتا ہے اور تم روح میں بدل جاتے ہو۔ اگر تم اس نور کی ایک جھلک ہو تو تم دھیان یا مراقبے کے وسیلے سے ایک زیادہ گہرا اور پائیدار رشتہ قائم کر سکتے ہو۔ اور تب کیا تم سمادھی کی راہ روک سکتے ہو؟ جب یہ تمہارے علم' شعور اور زندگی کا جزو بن جائے گا تو پھر جنس۔ شہوت کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہے گی۔

ایک دوست کو اندیشہ ہے کہ اگر جنس کو یوں ترک کیا گیا تو ہماری نسل کا کیا ہو

گا؟ اگر سب لوگ سادھی کے ذریعے تجرد حاصل کر لیں تو اگلی نسل کا کیا ہو گا؟

اس نوع کے بچے جو آج کل پیدا ہو رہے ہیں تب نہیں ہوں گے۔ زندگی کی تخلیق نو کا موجودہ طریقہ تو کتوں' بلیوں اور پست جانوروں کے لئے ہے' انسان کے لئے نہیں۔ یہ کس طرح کی ذہنیت ہے؟ بچوں کو بے سوچے پیدا کرنے کی؟ یہ بڑے پیمانے پر ہونے والی تخلیق؟ .... بے مقصد' بے فائدہ' حادثاتی!

آبادی اتنی بڑھنے والی ہے کہ اگر بروقت پابندی نہ لگائی گئی تو سائنسدانوں کے بقول سو برس میں ہی اتنی جگہ نہیں بچے گی کہ پاؤں بھی دھرا جا سکے۔ تم محسوس کرو گے کہ تم ہمیشہ عبادت گزاروں میں گھرے ہوتے ہو' جدھر تم دیکھو ایک جلسہ جاری ملے گا۔

دوست کا سوال بہت برمحل ہے کہ اگر تجرد عام ہو جائے تو بچے کیونکر پیدا ہوں گے؟ تب تو مذکورہ بالا نوعیت کا جلسہ کرانا مشکل امر ہو گا! میں اپنے دوست کو ایک چشم کشا حقیقت سے آشنا کرانا چاہتا ہوں اور تمہیں بھی اس پر توجہ دینی چاہیے کہ بچے تجرد سے بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس صورت میں بچوں کی پیدائش کا پورے کا پورا مقصد و منشا ایک نئی جہت کا حامل ہو گا۔

شہوت تخلیق نو کا سکون آفریں وسیلہ نہیں ہے۔ فقط تجرد ہی وہ مدبرانہ وسیلہ ہو سکتا ہے۔ بچے کی پیدائش بحالات موجودہ حادثاتی ہوتی ہے' تم کسی اور مقصد سے جنس کے لئے جاتے ہو' بچہ درمیان میں آ جاتا ہے۔ کوئی شخص بچہ پیدا کرنے کے لئے جنس میں نہیں جاتا۔ بچے تو بن بلائے مہمان ہوتے ہیں اور تم ان سے اسی قدر محبت رکھتے ہو جس قدر کہ کسی بن بلائے مہمان سے ہو سکتی ہے۔ اور بن بلائے مہمانوں سے کیسا سلوک روا رکھا جاتا ہے؟ ان کے آرام کے لئے بستر لگائے جاتے ہیں' کھانا پیش کیا جاتا ہے' ان کی ٹہل سیوا ہوتی ہے' ناز برداری کی جاتی ہے' تم اپنے ہاتھ باندھتے ہو .... لیکن یہ سب کچھ صرف ادب آداب کے تحت "روایتاً" کیا جاتا ہے۔ ہمارے اندر محبت کا سچا احساس نہیں ہوتا۔ مستقل سوچ یہ ہوتی ہے: "یہ عذاب کب ٹلے گا؟" اسی

طرح کا سلوک بے چارے بچوں سے روا رکھا جاتا ہے جس کی سادہ سی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ان کی خواہش ہی نہیں کی ہوتی ہم تو کچھ اور ہی چاہتے تھے' وہ تو ضمنی پیداوار ہوتے ہیں۔ دور حاضر کا بچہ پیداوار نہیں ضمنی پیداوار ہے۔ وہ پیدا نہیں کئے جاتے۔ وہ بس اس طرح پیدا ہو جاتے ہیں جیسے دانوں کے ساتھ بھوسہ۔ چنانچہ تمام دنیا اس کوشش میں ہے کہ جنس کو اس نوع کے حادثوں سے بچایا جائے۔ برتھ کنٹرول انسان کے اسی رجحان کا نتیجہ ہے۔ غیر فطری معاونات اختراع کئے جاتے ہیں تاکہ جنس سے تو حظ اٹھایا جائے لیکن بچوں سے محفوظ رہا جائے۔ انسان کو اس شر سے محفوظ رکھنے کی کوششیں صدیوں سے کی جا رہی ہیں۔

یہاں تک کہ قدیم آیورویدک صحیفوں میں بھی علاج درج ہیں۔ جدید دور کے خودغرض عالم بھی اس شے کے لئے مجبور ہیں جس کے لئے تین ہزار برس قبل کے آیورویدک پنڈت بھی فکر مند تھے .... کیوں؟

انسان اس تحقیق میں کیوں مستغرق ہے؟ بچے طوفان اٹھاتے ہیں۔ وہ ذمہ داری کا بوجھ لے کر آتے ہیں اور خطرہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بچے یا بچوں کی پیدائش کے بعد عورت میں جنس کے لئے ایک بے اعتنائی جنم لے گی۔ ایک آدمی جس کے بچے نہیں ہیں وہ ان کا خواہش مند ہو سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ بچوں سے محبت کرتا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ اپنی دولت سے محبت کرتا ہے۔ جب کوئی شخص بچے کی خواہش کرتا ہے تو اس مغالطے میں مت آ جانا کہ اس کی روح بچے کے لئے' ایک معصوم انسان کے لئے تڑپ رہی ہے! وہ سخت مشقت کر کے دولت اکٹھی کر رہا ہے اور کون جانتا ہے کہ اس کی موت کے بعد کون اس دولت کا مالک ہو گا؟ چنانچہ اسے اپنی املاک محفوظ کرنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کے لئے اپنے خون سے ایک بیٹے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی کو بھی بچے کی ضرورت فقط بچے کے لئے نہیں ہوتی۔ ہم خود کو بچانے کی سعی کرتے ہیں لیکن بچے اپنی شرائط پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ ہم جنس سے حظ اندوز ہو رہے ہوتے ہیں اور بچے درمیان میں آ دھمکتے ہیں۔ یہ جنسیت زدگی

کی ضمنی پیداوار ہے۔ چنانچہ یہ بہت بیمار' بہت کمزور' بہت زیادہ مایوس' بہت بانجھ' بہت پژمردہ اور بہت مضطرب ہوتی ہے۔

تجرد سے بھی پیدا ہو سکتی ہے لیکن اس کی یہ پیدائش جنس کی ضمنی پیداوار نہیں ہوگی۔ جنس بچوں کو جنم دینے کا ایک غیر مقصدی ذریعہ نہیں ہوگی۔ تم دہلی جانے کے لئے جہاز میں سوار ہوئے ہو' جہاز دہلی پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ منزل پر پہنچ کر تم یہ تو نہیں کہتے کہ تم جہاز سے باہر نہیں آؤ گے۔ جنس کے ذریعے شعور اعلیٰ کی حالت میں پہنچ کر' برہمچاریہ کو پا کر' جو الوہیت کے ساتھ رازونیاز کی سطح ہے' بچہ پیدا ہو تو یہ پیدائش ایک نئی تخلیق ہوگی! لیکن اب تک تو ہمارا اختراع پسند ذہن جنس سے مکمل لطف اندوزی کے لئے ایک دفاعی میکنزم بنانے میں محو رہا ہے۔ حالانکہ کوششیں اس کی متضاد سمت میں ہونی چاہیے تھیں۔ لیکن ہم ہیں کہ پالم ایئرپورٹ دہلی پر پہنچ کر بھی اپنی سیٹ چھوڑنے کے لئے آمادہ نہیں ہیں۔ کیا تم میرا موقف سمجھ گئے ہو؟ اگر برہمچاریہ عام ہو جائے تو اختراعات کی سمت روحانی ہو جائے گی۔ فی الوقت رجحان اس کی مخالف سمت میں ہے یعنی بچوں سے کراہت اور جنس سے برائے جنس لذت اندوزی!

لیکن میں اپنے دوست سے پوچھتا ہوں کہ وہ دنیا کو برہمچاریہ سے محفوظ رکھنے کے لئے کیوں متفکر ہے؟ اب بہت زیادہ تشویش پیدا ہوئی ہے کہ برہمچاریہ تجرد تخلیق نو کو روک سکتا ہے اور دنیا ختم ہو جائے گی! میرے دوست برہمچاریہ کا امکان صفر ہے۔ اور یہ اس وقت تک رہے گا جب تک جنس کے لئے سفاکانہ' شعوری اور واحد بے حرمتی رہے گی۔ تجرد سے دنیا کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ بلکہ مسلسل حادثاتی پیداوار کی وجہ سے فنا کا امکان روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ تم اسی طرح بچے پیدا کرتے رہے تو دنیا انجام کو پہنچ جائے گی۔ تمہیں ایٹم بموں یا ہائیڈروجن بموں کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ مستقلاً روزافزوں ہوتی آبادی' شہوت پرستی کی یہ بے انتہا ضمنی پیداوار خود کو برباد کر دے گی!!

برہمچاریہ کے نتیجے میں انسان مختلف وضع کا ہو جائے گا۔ وہ اتنی دراز عمر پائے گا

کہ جس کا اب تصور بھی نہیں کر سکتا! اس کی صحت بیماریوں سے پاک نہایت عمدہ ہو گی۔ اس کے خدوخال کسی پرشکوہ مجسمے کے سے ہوں گے! اس کی شخصیت سے الوہی خوشبو بکھرے گی۔ مہربانی' محبت' سچ حسن اور مذہب اس کا کردار ہوں گے۔ مذہب اس میں پیدائشی ہو گا۔ ایک نوع کی الوہیت مجسم ہو جائے گی!............ ہم لادینیت سے پیدا ہوئے ہیں' ہمیں پیدا ہوتے ہی مذہب کی مشکل میں ڈال دیا جاتا ہے' ہم لامذہبی میں مرتے ہیں اور اس دوران میں ...... پیدائش سے موت تک ...... سارے عرصہ حیات میں' شب وروز ہم مذہب کے متعلق باتیں اور باتیں کرتے رہتے ہیں۔

اس اعلیٰ نوع انسان میں مذہب کا کوئی کردار' کوئی بحث نہیں ہوگی کیونکہ مذہب ان کا طرز حیات ہوگا۔ ہم اس کے متعلق بحث کرتے ہیں جو ہماری زندگی میں ہی نہیں ہے۔ ہم عموماً" اس کے متعلق گفتگو نہیں کرتے ہیں جو ہماری زندگی کا جزو ہے۔ مثال کے طور پر ہم جنس کے متعلق بات نہیں کرتے کیونکہ یہ ہمارا طرز حیات ہے۔ لیکن ہم خدا کے متعلق ضرور بحث کرتے ہیں کیونکہ یہ ہمارا طرز حیات نہیں ہے۔ درحقیقت ہم جن چیزوں کو حاصل نہیں کر پاتے ان کے متعلق باتیں کرتے اور اپنے آپ کو مطمئن کرتے ہیں۔

یہاں میں تمہیں ایک مختصر حکایت سنانا چاہتا ہوں۔ ایک درویش کو ایک بار دوران سفر میں ایک اسی جگہ عبادت کا اتفاق ہوا جہاں ایک پنڈت بھی عبادت گزار تھا۔ عبادت کر چکنے کے بعد جب دعا کا وقت آیا تو درویش با آواز بلند خدا سے مانگنے لگا: "اے میرے خدا! اے میرے مالک! مجھے ڈھیر سارا سونا' چاندی' ہیرے دے۔ اے حسن کے خالق! مجھے ایک حسین رفیق حیات بخش دے۔"

درویش کی یہ "گستاخانہ" دعا سن کر پنڈت کو تو آگ ہی لگ گئی۔ اس نے اپنے رعب وجلال مذہبیت کا بھرپور اظہار کرتے ہوئے دریافت کیا: "احمق شخص! تم نہیں جانتے دعا کیونکر کی جاتی ہے؟ خدا سے' سب مخلوقات اور ہر جہان کے مالک سے تم ایسی فضول دنیاوی چیزیں مانگ رہے ہو؟ کیا تم نہیں جانتے کہ وہ ہر شے بخش سکتا ہے ----

اس کی زندگی چین، سکون اور ایمان دار زندگی۔ تم اس سے سچائی، راستی اور ایمان کے لئے دعا کیوں نہیں ہو؟ میں تو ہر عبادت کے بعد اسی طرح دعا کرتا ہوں"

درویش نے بڑے تحمل سے پنڈت کی یہ خود فریبی اور اناڑدگی سے بھری ہوئی تقریر سنی اور کہا: "اے عالی مرتبت پنڈت! تم خدا سے درست دعا کرتے ہو اور میں بھی۔"

پنڈت اس کے اس بے باکانہ جواب سے مزید مشتعل ہوا اور کہنے لگا: "اس مہمل گوئی سے تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو۔ میں بھی درست دعا کرتا ہوں اور تم بھی۔ یہ کیونکر ممکن ہے؟"

درویش نے کہا: "ایسا ممکن ہے۔ دراصل ہم وہی کچھ تو دعا میں مانگتے ہیں جو ہمارے پاس نہیں ہوتا۔"

اس حکایت میں جو حکمت مضمر ہے اس سے ضرور تمہارے قلب روشن ہوئے ہوں گے۔

کیا تم نے توجہ نہیں کی کہ عورتیں مردوں سے زیادہ جھگڑالو ہوتی ہیں۔ کسی پہ حملہ مقصود نہیں تاہم کہنا یہ ہے کہ دو عورتیں کہیں موجود ہوں اور وہ دیر تک خاموش رہیں، یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ میں نے سنا ہے کہ چین میں سب سے بڑا جھوٹ بولنے کا مقابلہ ہوا۔ ملک بھر کے دروغ گو مقابلہ گاہ میں اکٹھے ہو گئے۔ سب سے بڑے جھوٹے کو بہت قیمتی انعام ملنا تھا۔ اپنی باری آنے پر ایک دروغ گو نے کہا: "میں ایک پارک میں گیا، میں نے وہاں دو عورتوں کو بیٹھے دیکھا۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھی تھیں اور بالکل خاموش تھیں۔" منصفین نے اس جھوٹ کو مقابلے کا سب سے بڑا جھوٹ قرار دیتے ہوئے اس دروغ گو کو پہلا انعام عطا کیا۔ عورت اس قدر کیوں بولتی ہے؟ اس لئے کہ مرد کام کرتے ہیں جبکہ عورتیں کام نہیں کرتی ہیں۔ جب کام ہی نہ ہو، کوئی حرکت ہی نہ ہو تو کاہل گپیں ہانکتے ہیں۔ اس نوع کا نسائی عیب ہندوستان کا قومی کردار ہے۔ یہاں کوئی ترقی نہیں ہے، صرف باتیں اور بحثیں ہیں۔

برہمچاریہ سے پیدا ہونے والا نیا انسان باتونی نہیں ہو گا، وہ ولولہ خیز ہو گا مگر فضول باتیں نہیں کرے گا، مذہب کی باتیں تو بالکل نہیں کرے گا۔ تب مذہب کو لوگ موضوع بحث کے طور پر، بھول جائیں گے کیونکہ مذہب ان کی فطرت ہو گا۔ یہ تصور کر کے ہی انسان حیران ہوتا ہے، اس میں جذبہ احترام بیدار ہو جاتا ہے۔ اسے پہلے بھی ایسے انسان پیدا ہوئے ہیں لیکن ان کی پیدائش حادثاتی تھی۔ کبھی کبھار اتنا خوب صورت انسان پیدا ہو جاتا ہے کہ لباس بھی اس کی خوب صورتی میں اضافہ نہیں کر سکتا۔ وہ بغیر کپڑوں کے — عریاں ہی اٹھتا ہے۔ اس کے حسن کی تابش دور و قریب پھیل جاتی ہے، لوگ اس کا دیدار کرنے کے لئے اس کے اردگرد مجتمع ہو جاتے ہیں۔ سنگ مرمر کے اس جیتے جاگتے مجسمے کو محبت پاش نگاہوں سے دیکھنے کے لئے! اس طرح کا آدمی بہت زیادہ اجالے میں ہوتا ہے۔ اس کا اصل نام وردھامنا ہوتا ہے لیکن لوگ اسے مہویر پکار اٹھتے ہیں۔ یہ اس کے اندر برہمچاریہ کا نور تھا کہ لوگ اس آدمی کو خدا کی طرح سجدے کرتے ہیں۔

کبھی کبھار کوئی بدھا جنم لیتا ہے۔ کوئی عیسیٰ پیدا ہوتا ہے۔ کوئی کنفیوشس پیدا ہوتا ہے۔ ہم انسانیت کی پوری تاریخ میں بمشکل چند ایک نام ہی گنوا سکتے ہیں۔

جب بچے تجرد سے، الوہی ملاپ سے پیدا ہونے لگیں گے تو ممکن ہے کہ تم اس جملے کو سننا بھی پسند نہ کرو: "تجرد سے جنمے بچے۔" لیکن میں ایک نئے تصور، ایک شریف تر امکان پر بات کر رہا ہوں۔ جب بچے تجرد سے پیدا ہوں گے انسانیت اتنی خوب صورت، اتنی طاقتور، اتنی پر خیال، اتنی توانا اور اتنی ذہنی ہو گی کہ انا کا علم یا ماورائے انا کا علم یا آفاقی شعور کا علم سرحد ادراک سے پرے نہیں ہو گا۔ چونکہ اس کا تصور کرنا دشوار ہے چنانچہ مجھے اجازت دو کہ میں ایک مثال سے اس کی وضاحت کروں۔ اگر تم بے خوابی کے کسی مریض کو بتاؤ کہ تم سرہانے پر سر رکھتے ہی سو جانے کے اہل ہو تو اسے یقین نہیں آئے گا۔ وہ کہے گا کہ وہ تو بستر میں کروٹیں بدلتا رہتا ہے، اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے، تسبیح پھیرتا ہے، بھیڑیں گنتا ہے لیکن سو نہیں پاتا۔ وہ کہے گا

کہ تم جھوٹے ہو۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ بستر پہ لیٹتے ہی تمھیں فوراً" نیند آ جائے؟ وہ شکایت کرے گا کہ بے شمار تجربوں کے باوجود وہ بے فکری کی نیند نہیں سو سکتا' بعض اوقات تو ساری ساری رات جاگتا رہتا ہے۔ نیویارک کی تمیں سے چالیس فی صد آبادی خواب آور گولیاں کھاتی ہے اور ماہرین نفسیات کو اندیشہ ہے کہ آئندہ سو برس میں کوئی ایک شخص بھی گولیوں کے بغیر نہیں سو سکے گا۔ تب ہر شخص سونے کے لے نیند کی دوا کھایا کرے گا۔ اگر نیویارک میں ذہنی صحت مندی کا یہ عالم ہے تو ایسا ہندوستان میں دو سو برس میں ممکن ہو گا کیونکہ ہندوستانی پیشوا غیر ملکیوں کی نقالی میں بہت پیچھے نہیں رہ پاتے۔ ہم زیادہ پیچھے نہیں رہ سکتے۔ جب ہم ہر شے ان سے چرا سکتے ہیں تو اس کو کیونکر نظر انداز کر سکتے ہیں؟ ------ پس پانچ سو برس میں یہ ممکن ہے کہ دنیا کا ہر آدمی نیند کی گولیاں کھا رہا ہو گا۔ بچہ پیدا ہوتے ہی دودھ نہیں نیند کی گولیاں مانگے گا کیونکہ وہ رحم مادر میں پرسکون نہیں رہا! اس وقت لوگوں کو یہ باور کرانا دشوار ہو گا کہ پانچ سو برس پہلے کے لوگ بس آنکھیں بند کرتے ہی سو جاتے تھے' انھیں نیند کی گولیاں نہیں کھانا پڑتی تھیں۔ وہ کہیں گے کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟

اسی طرح "تجرد سے جنسی انسانیت" کا باور کرانا دشوار ہے کیونکہ لوگ بددیانت' چور اور قاتل ہیں' یہ انسان خودکشی کرتے ہیں' زہر پیتے ہیں' شراب خوری کرتے ہیں' ایک دوسرے کو چھرے گھونپتے اور جنگیں برپا کرتے ہیں۔ وہ یہ بھی یقین کریں گے کہ انسان احمقانہ جنس سے' جو جسمانی سطح سے گہری نہیں ہوتی ہے' پیدا ہوا کرتا تھا۔

ایک روحانی جنس کا ظہور ہو گا' نئی زندگی آغاز ہے۔ میں نے گزشتہ صفحات میں تمھیں روحانی وجود کی نئی سطح پہنچنے کے امکان کے متعلق بتایا تھا۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم نے وہ سب کچھ محبت سے پڑھا ہو گا ------ اگرچہ ایسے فکری نظام کو سکون سے پڑھنا خاصا دشوار ہے۔ تمھیں ضرور شرمندگی ہوئی ہو گی ------ لیکچرز کے دوران میں ایک دوست آیا اور اپنے خوف کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ چند لوگ یہ سمجھتے ہوئے کہ اس

طرح کے موضوع پر تقریر نہیں ہونی چاہیے ------ انھیں گے اور شور مچائیں گے کہ لیکچر بند کرو۔ وہ عوام میں اس طرح کے موضوع کے خلاف زبردست احتجاج کر سکتے ہیں۔ میں نے اسے کہا یہ بہت اچھی بات ہے کہ اتنے بہادر آدمی کہیں موجود ہیں۔ ایسے بہادر لوگ کہاں ہو سکتے ہیں جو بھرے جلسے میں انھیں اور مقرر کو تقریر روک دینے کا کہیں؟ اگر اس ملک میں ایسے بہادر لوگ ہیں تو احمق لوگوں کی لمبی قطار کی احمقانہ تقریریں بہت عرصہ پہلے رک چکی ہوتیں۔ لیکن وہ نہیں روکے گئے ہیں' ہنوز روکے نہیں جا رہے ہیں۔ میں ایسے بہادر آدمی کا منتظر ہوں جو اٹھے اور مجھے تقریر روک دینے کا اس وقت کہے جب میں موضوع کی جزئیات پر بات کر رہا ہوں۔ یہ میری خوشی کا باعث ہو گا!

پس ایسا موضوع' ایسی تقریر سنی گئی جس پر کئی دوست خوف زدہ ہیں کہ مبادا کوئی شخص احتجاج کے لیے نہ اٹھ کھڑا ہو اور گڑبڑ نہ پھیلا دے۔ یہ ان کی مہربانی تھی۔ پرسکون ہو کر سننے کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔ آخر پر دل کی گہرائیوں سے میں دعا کرتا ہوں کہ ہمارے اندر کی شہوت زینہ بن جائے جس کے ذریعے ہم محبت کے معبد تک رسائی حاصل کر پائیں۔ جنسی جذبہ جو ہم میں سے ہر ایک کے اندر موجود ہے' شعور اعلیٰ تک پہنچنے کا وسیلہ بن جائے۔ آخر میں میں اس ذات اعلیٰ و ارفع کے آگے جھکتا ہوں جو ہم میں سے ہر ایک کے اندر موجود ہے۔

آداب بجا لاتا ہوں!